مسلسل اشاعت کے 60 سال

ربیع الاوّل ۱۴۴۸ھ
اگست ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ھَاذِمُ اللَّذَّات
- زوالِ اُمّتِ مسلمہ: اسباب، سبق اور نشاۃِ ثانیہ کا راستہ
- رسولِ اکرم ﷺ اور ماحول کا تحفظ
- مقدسات کی حرمت و تحفظ اور ریاست کی ذمہ داریاں
- تصوّرِ اقامتِ دین
- بدلتی عالمی صورتحال اور پاکستان کے پیچیدہ داخلی مسائل

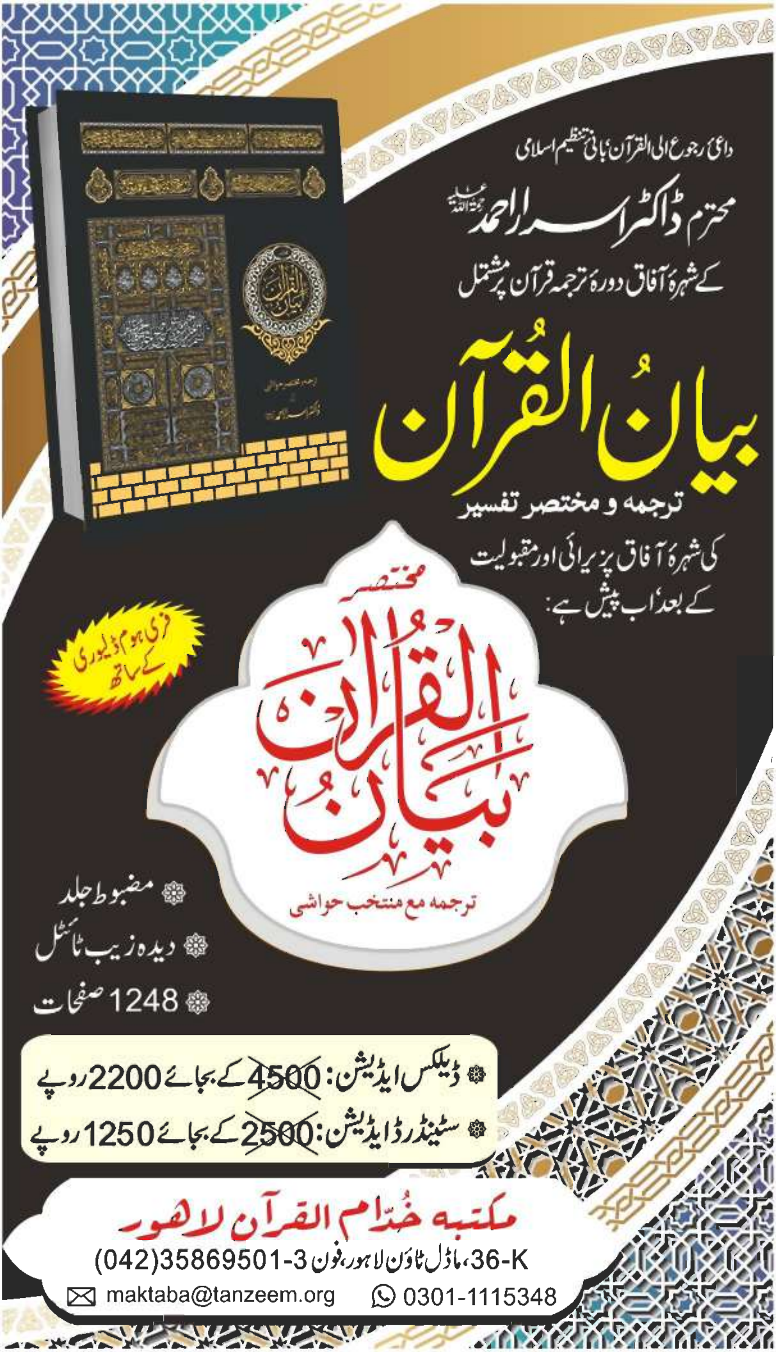

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:
فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ
مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی
مضبوط جلد
دیدہ زیب ٹائٹل
1248 صفحات
ڈیلکس ایڈیشن: 4500 کے بجائے 2200 روپے
سٹینڈرڈ ایڈیشن: 2500 کے بجائے 1250 روپے
مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

’’اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!‘‘

جلد	:	75
شمارہ	:	9
ربیع الثّانی		1448ھ
ستمبر		2026ء
فی شمارہ	:	60 روپے
سالانہ زرِتعاون	:	600روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر مسئول

شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی

حافظ عاکف سعید

مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت

○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا

○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران

○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321

publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ’’دارالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700

فون: 3-(042) 35869501 ، 0341-4941212

ای میل: maktaba@tanzeem.org

پبلشر: سکریٹری دین حق ٹرسٹ، لاہور مطبع: آر آر پرنٹرز، سگیاں روڈ، لاہور

مشمولات

عرضِ احوال — 5

مکّہ معاہدہ: اُمّتِ مُسلمہ کی نئی صف بندی یا امتحان؟ — رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ — 9

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کے تقاضے — شجاع الدین شیخ

درسِ قرآن — 27

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۱۱) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ابوظبی سیریز (۶) — 40

تواصی بِالصّبر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نقوشِ سیرت — 65

رحمۃٌ لِلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم — حافظ محمد اسد

ذکر و فکر — 69

عظمتِ لا الٰہ الّا اللّٰہ — ڈاکٹر ربیعہ ابرار

ظروف و احوال — 83

مکّہ معاہدہ — ایوب بیگ مرزا

دعوتِ فکر — 92

قوی مومن بنیے! — محمد عثمان عباس

’’ادارہ‘‘ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مکّہ معاہدہ: اُمّتِ مُسلمہ کی نئی صف بندی یا امتحان؟

ستمبر کا مہینہ ہر سال عالمی سفارت کاری کا مرکز بن جاتا ہے۔ نیو یارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس‘ سلامتی کونسل کے مباحث‘ عالمی امن‘ انسانی حقوق‘ پائیدار ترقی اور بین الاقوامی تعاون کے خوش نما نعروں سے دنیا کی فضا گونجنے لگتی ہے۔ طاقتور ممالک کے سربراہ ایک دوسرے سے مصافحے کرتے ہیں‘ مشترکہ اعلامیے جاری ہوتے ہیں اور دنیا کو ایک بہتر مستقبل کی نوید سنائی جاتی ہے۔ لیکن انہی ایوانوں سے ہزاروں میل دور غزہ کے ملبے تلے دبی انسانیت‘ فلسطین کے بے گھر خاندانوں‘ کشمیر کی خاموش وادیوں‘ سوڈان کے خون آلود میدانوں اور دیگر مظلوم خطوں کی آہیں ایک سوال بن کر اُبھرتی ہیں کہ کیا عالمی امن صرف تقریروں کا موضوع رہ گیا ہے یا اس کے لیے کوئی حقیقی اخلاقی بنیاد بھی باقی ہے! یہ سوال صرف اقوامِ متحدہ سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے ہے اور سب سے بڑھ کر اُمّتِ مُسلمہ سے۔

ایسے وقت میں جب غزہ کی جنگ نے نہ صرف ہزاروں جانیں نگل لی ہیں بلکہ مشرقِ وسطیٰ کی سیاست کا رُخ بھی بدل کر رکھ دیا ہے‘ خطے میں نئے اتحاد بن رہے ہیں۔ پرانے تعلقات ازسرِنو ترتیب پا رہے ہیں۔ عالمی طاقتیں آنے والے عشروں کے لیے اپنے مفادات کا نقشہ مرتب کر رہی ہیں‘ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پورے منظرنامے میں مسلمان اکثریت فیصلہ ساز نہیں بلکہ فیصلوں سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ غزہ کی تباہی نے پوری دنیا پر ایک حقیقت آشکار کر دی ہے کہ جدید اسلحہ‘ سفارتی طاقت اور معاشی مفادات کے اِس دور میں محض اخلاقی اپیلیں مظلوم قوموں کو انصاف نہیں دلا سکتیں۔ بین الاقوامی قانون کی باتیں اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوتیں جب تک اُن کے پیچھے اجتماعی قوت‘ سیاسی عزم اور اخلاقی استقلال موجود نہ ہو۔ گزشتہ کئی برسوں میں بارہا یہ منظر سامنے آیا کہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قراردادیں زیرِ بحث آئیں‘ مگر ویٹو کی

سیاست نے اُنہیں روک دیا اور ظلم اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری رہا۔

قرآن مجید سورۃ الحجرات‘ آیت ۱۰ میں جب اہلِ ایمان کو ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ محض ایک روحانی رشتہ بیان نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی اجتماعی حقیقت کی بنیاد رکھتا ہے جس میں ایمان‘ سیاست‘ معیشت‘ تہذیب اور اجتماعی ذمہ داری ایک دوسرے سے جدا نہیں رہتے۔ مسلمانوں کی اصل طاقت اُن کے وسائل سے پہلے اُن کی وحدت تھی۔ جب تک یہ وحدت قائم رہی‘ اُمّت نے دنیا کی قیادت کی‘ لیکن جب اللہ کی رسّی کو ہاتھ سے چھوڑا گیا تو یہ وحدت منتشر ہوگئی۔ اقوامِ متحدہ کی عمارت کے سامنے آج دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے پرچم لہراتے ہیں‘ لیکن اُمّتِ مُسلمہ کا کوئی مشترکہ پرچم نہیں۔ دو ارب سے زائد مسلمانوں کے باوجود کوئی ایسی متفقہ سیاسی حکمتِ عملی موجود نہیں جو عالمی سطح پر اُن کے اجتماعی مفادات کی ترجمانی کر سکے۔ آج اُمّت تو موجود ہے مگر اُس کی اجتماعی قوت منتشر ہے۔

یہ انتشار صرف فلسطین تک محدود نہیں۔ کشمیر سے سوڈان تک‘ شام سے یمن تک‘ جہاں کہیں بھی مسلمان بحران کا شکار ہیں‘ وہاں اُمّت کی بے بسی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سبب صرف بیرونی سازشیں نہیں بلکہ مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں بھی ہیں۔ قومی مفادات نے اُمّت کے اجتماعی تصور کو پس منظر میں دھکیل دیا‘ فرقہ واریت نے اخوت کو مجروح کیا اور معاشی انحصار نے سیاسی خودمختاری کو محدود کر دیا۔

اسی بدلتے ہوئے منظرنامے میں ۷ اگست ۲۰۲۶ء کو مکّہ مکرمہ میں پاکستان‘ سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان ہونے والا مشترکہ دفاعی معاہدہ ایک اہم پیش رفت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ معاہدہ خطے کے بدلتے ہوئے سیاسی و تزویراتی حالات میں ایک نئی سمت کی علامت بھی سمجھا جا رہا ہے۔ یہ معاہدہ اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کی بنیاد پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان طویل عرصے سے جاری دفاعی تعاون اور ستمبر ۲۰۲۵ء میں دونوں ملکوں کے درمیان طے پانے والے باہمی دفاعی معاہدے میں موجود تھی۔ بعد ازاں علاقائی حالات اور دونوں ملکوں کے مفادات نے اِس دائرے کو مزید وسیع کرنے کی ضرورت پیدا کی اور ترکیہ کی شمولیت اسی عمل کا اگلا مرحلہ بنی۔ یوں پاکستان کی عسکری صلاحیت‘ ترکیہ کی فوجی و تکنیکی قوت اور سعودی عرب کی معاشی و جغرافیائی اہمیت ایک ہی دفاعی بندوبست میں جمع ہوگئی۔ اجتماعی دفاع

کی شق بظاہر نیٹو کے آرٹیکل ۵ سے مشابہ ہے‘ یعنی کسی ایک رکن پر حملہ مشترکہ خطرہ سمجھا جائے گا۔ تاہم اس کے عملی خدوخال ابھی تشکیل پانے کے مرحلے میں ہیں۔ ترکیہ کے مطابق تینوں ممالک سیاسی اور عسکری سطح پر اعلیٰ رابطہ کاری کا نظام قائم کریں گے۔ مشترکہ فوجی مشقیں ہوں گی اور زمینی‘ فضائی‘ بحری اور سائبر شعبوں میں تعاون بڑھایا جائے گا۔ ڈرونز‘ الیکٹرانک وارفیئر‘ مصنوعی ذہانت اور دفاعی صنعت میں مشترکہ پیداوار اور ٹیکنالوجی کی منتقلی بھی اس تعاون کا حصہ ہوگی۔ اس طرح یہ معاہدہ صرف روایتی عسکری دفاع تک محدود رہنے کے بجائے جدید حربی تقاضوں کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر سکتا ہے۔

معاہدے کے بعد ایک اہم سوال سامنے آیا کہ: کیا یہ نیا دفاعی بندوبست ایران کے خلاف بنایا گیا ہے؟ پاکستان کی حکومت نے اس تاثر کو واضح طور پر مسترد کیا۔ معاہدے کو خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے بھی اہم تھی کہ پاکستان پہلے ہی ایران کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کی کوششوں میں شریک رہا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ سعودی عرب کے ساتھ اُس کا دفاعی معاہدہ ایران کے ساتھ براہِ راست محاذ آرائی کا ذریعہ بن جائے۔

ایران کا ردِّعمل بھی اسی تناظر میں خاصا اہم رہا۔ معاہدے کے بعد ایرانی وزارتِ خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی نے کہا کہ ایران کو اِس معاہدے سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایران کی جانب سے اس نسبتاً محتاط ردِّعمل نے بھی یہ تاثر مضبوط کیا کہ مکہ معاہدے کو فوری طور پر کسی نئے محاذ یا ایران مخالف فوجی اتحاد کے طور پر دیکھنا شاید قبل از وقت ہوگا۔ تاہم مکہ معاہدے کی اصل آزمائش بھی اسی مقام پر شروع ہوتی ہے۔ اگر کسی رکن ملک پر واقعی بڑا حملہ ہوتا ہے تو کیا باقی دونوں ممالک عملی فوجی مدد فراہم کریں گے؟

اس معاہدے کی ایک اور اہم جہت اس کا ممکنہ پھیلاؤ ہے۔ صدر رجب طیب اردوان نے مصر کی ممکنہ شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ اگر مصر واقعی اس دائرے میں آتا ہے تو اس دفاعی بندوبست کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت مزید بڑھ سکتی ہے‘ کیونکہ پھر خلیج‘ جنوبی ایشیا‘ اناطولیہ اور شمالی افریقہ کی ایک بڑی مسلم طاقت ایک ہی وسیع تر دفاعی فریم ورک کا حصہ بن سکتی ہے۔

اس سارے معاملے کا حیران کن پہلو امریکی ردِّعمل ہے۔ بظاہر یہ توقع تھی کہ امریکہ اس دفاعی بندوبست کو دیکھ کر محتاط یا تشویش پر مبنی ردِّعمل ظاہر کرے گا‘ لیکن صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے

خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ’’بڑا‘ جراَت مندانہ اور پہلا اہم قدم‘‘ قرار دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکا فی الوقت مکّہ معاہدے کو اپنے خلاف بننے والے کسی متبادل سکیورٹی نظام کے طور پر نہیں دیکھ رہا۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا اِس نئے بندوبست کو اپنی وسیع تر علاقائی حکمتِ عملی کے ساتھ متصادم نہیں سمجھتا‘ خصوصاً اس لیے کہ پاکستان‘ سعودی عرب اور ترکیہ تینوں ہی امریکا کے ساتھ مختلف سطحوں پر تعلقات رکھتے ہیں۔ تاہم عالمی سیاست میں مفادات بدلتے رہتے ہیں‘ ترجیحات تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور حالات کے ساتھ اتحادوں کی نوعیت بھی بدل سکتی ہے۔

کیا مکّہ معاہدہ اُمّتِ مُسلمہ کے منتشر وجود کو کسی مشترکہ قوت میں تبدیل کرنے کی جانب پہلا قدم بن سکتا ہے یا یہ بھی موجودہ علاقائی صف بندیوں کا ایک محدود مظہر بن کر رہ جائے گا؟ اِس کا جواب آنے والے دنوں میں اِس پر ہونے والی عملی پیش رفت دے گی۔ تینوں ممالک اگر اپنے دفاعی تعاون کو ادارہ جاتی شکل دیتے ہیں تو اِس کے اثرات یقیناً دُوررس ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ معاہدہ صرف مخصوص حالات سے نمٹنے یا چند ممالک کے باہمی مفادات کے تحفظ تک محدود رہ گیا تو اِسے اُمّت کی اجتماعی قوت کی بحالی کا نقطۂ آغاز قرار دینا مشکل ہو گا۔ اُمّت کی حقیقی قوت اُس اجتماعی شعور میں ہے جو مسلمانوں کو اپنے مشترکہ مسائل‘ مشترکہ مفادات اور مشترکہ ذِمّہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ مکّہ معاہدے کو صرف پاکستان‘ سعودی عرب اور ترکیہ کے تعلقات کے تناظر میں دیکھنا ناکافی ہے۔ اِس میں اُمّتِ مُسلمہ کے لیے ایک بڑا سبق بھی پوشیدہ ہے۔ مسلمان اگر اپنی جغرافیائی‘ معاشی‘ افرادی‘ عسکری اور تہذیبی قوتوں کو باہمی تعاون کے لیے استعمال کریں تو اُن کے پاس بھی عالمی سیاست میں باوقار کردار ادا کرنے کے لیے وسائل کی کوئی کمی نہیں۔

غزہ نے ہمیں یہ سبق انتہائی کرب کے ساتھ دیا ہے کہ صرف تعداد طاقت نہیں بنتی‘ وسائل کا ہونا بھی کافی نہیں اور محض اخلاقی برتری بھی ظلم کو روکنے کے لیے ہمیشہ کافی نہیں ہوتی۔ قوت اُس وقت بنتی ہے جب وسائل‘ صلاحیت‘ نظم‘ سیاسی بصیرت‘ اجتماعی عزم اور واضح مقصد ایک سمت میں جمع ہوں۔

(باقی صفحہ 96 پر)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کے تقاضے

شجاع الدین شیخ‘ امیر تنظیم اسلامی

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

اللہ تعالیٰ کو ہم مانتے ہیں اور بہت سے دوسرے لوگ بھی مانتے ہیں۔ یہودی بھی مانتے ہیں‘ نصاریٰ بھی مانتے ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ سب سے پہلی اہم بات ہے۔ قانونی اعتبار سے وہ شخص مسلمان ہے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری رسول مانے۔ یہودی اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ آخرت کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں مانتے‘ لہٰذا وہ مسلمان نہیں۔ نصاریٰ اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ آخرت کا اگرچہ بگڑا ہوا عقیدہ رکھتے ہیں مگر مانتے ہیں‘ لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے وہ ایمان والے نہیں ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہر قول کی تصدیق

فقہاء نے اس بارے میں لکھا ہے کہ مسلمان کون ہے! ایمان کی تعریف کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کے حوالے سے فقہاء نے اس بات کو بیان کیا کہ ایمان کس چیز کا نام ہے! تکنیکی طور پر اس کی تعریف یہ کی گئی: تصدیقُ بما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم۔ ہر وہ بات‘ ہر وہ خبر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عطا فرمائی اس کی تصدیق کرنا ایمان ہے۔ میرا اور آپ کا ایمان اس بات پر قائم ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ کا آخری رسول مانتے ہیں اور ان کی بتائی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ سب سے پہلا اہم معاملہ ہے۔ کوئی اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرے‘ آخرت کو ماننے کا دعویٰ کرے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اور آپؐ کی ختمِ نبوت پر

☆ مدینہ منورہ میں حُجاج کرام کے ایک نمائندہ اجتماع سے گفتگو

ایمان نہ رکھے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ایک ہے زبان سے اقرار کرنا‘ ایک ہے دل سے تصدیق کرنا۔ بچپن سے ہم نے ایمانِ مجمل کے بارے میں پڑھا ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ، وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

’’میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ ہے اپنی ذات وصفات کے ساتھ‘ اور میں نے اُس کے تمام احکام کو قبول کیا‘ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے۔‘‘

قرآنِ حکیم مسلمانوں کو کہتا ہے کہ اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (النساء:۱۳۶)

ایمان والوں سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ایک ایمان زبان کی نوک تک محدود ہوتا ہے‘ جبکہ ایک ایمان دل میں ہوتا ہے۔ یہاں اُس ایمان کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ جب دل سے اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان ہوگا تو آپ ﷺ سے محبّت بھی ہوگی‘ ادب اور احترام بھی ہوگا۔ تعلیماتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر یقین بھی ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اتّباع بھی ہوگی۔ بندۂ مؤمن کو رسول اکرم ﷺ کے مشن اور جِدّوجُہد سے بھی نسبت ہوگی۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے تعلق کے تقاضوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایمان کے بارے میں تو یہ بات ہمارے سامنے آگئی کہ زبان کا اقرار کافی نہیں بلکہ دل کی تصدیق بھی ضروری ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ سے محبّت

قرآنِ کریم میں بتایا گیا:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ﴾ (الاحزاب:۶)

’’نبی ﷺ ایمان والوں کے نزدیک ان کی جانوں سے بڑھ کر عزیز اور مقدم ہیں۔‘‘

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہٖ وَ وَلَدِہٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) [صحیح البخاری:۱۵]

’’تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد‘ اس کی اولاد اور سارے انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔‘‘

انسانوں سے بڑھ کر‘ والد سے بڑھ کر‘ اولاد سے بڑھ کر جب تک اللہ کے رسول ﷺ سے

محبّت نہ ہو‘ ایمان مکمل نہیں۔ اس سے اگلی بات بھی بخاری شریف کی ایک حدیث میں آتی ہے۔ سیدنا عمرؓ سے اللہ کے رسول ﷺ نے دریافت فرمایا: ’’تم مجھ سے کتنی محبّت کرتے ہو؟‘‘ انہوں نے دل کی بات عرض کردی: ’’یارسول اللہ ﷺ! میری جان کے سوا باقی ہر شے سے بڑھ کر آپؐ سے محبّت ہے۔‘‘ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’اے عمر! ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں۔‘‘ سیدنا عمرؓ خاموش ہوئے‘ کچھ توقف کیا اور کچھ دیر کے بعد سوچ سمجھ کر عرض کی: ’’یارسول اللہ ﷺ! اب مجھے میری جان سے بڑھ کر آپؐ سے محبّت ہے۔‘‘ تب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ((الآن یا عمر)) ’’اے عمر! اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔‘‘ یہ اصولی بات ہے کہ ہمیں ہماری جان سے بڑھ کر اللہ کے رسول ﷺ سے محبّت کرنی ہے۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں آٹھ محبتوں کا ذکر ایک طرف ہے اور تین محبتوں کا ذکر دوسری طرف۔ فرمایا:

﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ﴾

’’(اے نبی ﷺ) فرما دیجیے: اے لوگو! اگر تمہیں تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ مکانات (اور محلات) جو تمہیں بڑے محبوب ہیں‘‘

یہ آٹھ محبتیں آ گئیں: باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، مال، تجارت، گھربار۔

﴿اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ﴾

’’اگر تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اللہ کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو‘ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔‘‘

﴿وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

’’اور اللہ فاسقین کی قوم کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔‘‘

ہمارے استاذ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بندہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرے۔ ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں رکھو: باپ‘ بیٹے‘ بھائی‘ بیویاں‘ رشتہ دار‘ مال‘ تجارت‘

گھر بار (جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ع ''یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند'')۔ دوسرے پلڑے میں اللہ کی محبّت' اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبّت رکھو۔ پھر دیکھو کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر گھر والوں کی محبّت' مال کی محبّت' تجارت کی محبّت' دنیا کی محبّت کا پلڑا غالب ہے' جھکا ہوا ہے تو پھر جاؤ انتظار کرو اللہ کے فیصلے کا' موت آ جائے یا عذاب آ جائے' ایسے فاسقوں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا۔ اگر دوسرا پلڑا بھاری ہے تو یہ ایمان والوں سے مطلوب ہے۔ اس آیت میں غور وفکر کا سامان ہے۔ کیا ہماری محبّت سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے ہے؟ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور جو واقعتاً ایمان والے ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبّت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔''

ہم اہلِ ایمان کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ شب و روز کے معاملات میں بڑے مواقع آتے ہیں۔ جب برادری کا چال چلن' رسم و رواج کا کوئی معاملہ اوپر آ جاتا ہے تو دین نیچے چلا جاتا ہے۔ نفس کی خواہشات کے مطابق بات اوپر آ جاتی ہے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم نیچے چلی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر سُنّت کی تعلیم کو پامال کرتے ہیں جبکہ بے حیائی' بے پردگی' ناچ گانا' ہلا گلا نمایاں ہو جاتا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی محبّت ہمارے نزدیک تمام محبتوں پر priority پر ہے! ٹاپ پر ہے؟ چنانچہ پہلی بات یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی محبّت بھی ایمان کا تقاضا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ادب

اگلی بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ادب' احترام' عزت' تعظیم بھی ایمان کا تقاضا ہے۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دیں تو وہاں بھی لکھا ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②﴾

(الحجرات)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (ﷺ) کی آواز سے بلند نہ کرنا' اور ان کے سامنے اس طرح بلند آواز سے باتیں نہ کرنا جیسے ایک دوسرے کے سامنے (ہلکے انداز

میں) کر لیتے ہو‘ مبادا تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں شعور بھی نہ ہو۔‘‘

بندے کو یہ معلوم ہو کہ اس نے گناہ کیا ہے تو وہ توبہ کرنے کی کوشش کر لے گا۔ اگر بندے کو یہ احساس ہی نہیں کہ میری نیکیاں برباد ہوگئیں تو ایسی صورت میں توبہ کیسے کرے؟ اللہ کے رسول ﷺ کے ادب کے بارے میں یہ قرآنِ پاک کی حساس ترین آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے‘ مسجدِ نبوی میں بھی آوازیں بلند ہوتی ہیں‘ روضۂ رسول پر بھی آوازیں بلند ہوتی ہیں‘ چیخنا چلانا ہو جاتا ہے‘ موبائل کھلے ہوتے ہیں‘ گپ شپ چل رہی ہوتی ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک لوہار نے مسجد نبویؐ کے قریب دکان کھولی۔ لوہے پر ہتھوڑے کی چوٹیں لگانے سے سارا دن شور پیدا ہوتا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے اس کو حکم دیا کہ دکان دور لے کر جاؤ‘ اِدھر آواز نہیں آنی چاہیے۔ اسی طرح مدینہ منورہ سے باہر سے کچھ لوگ آئے‘ تو مسجد نبوی میں ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ’’اگر تم مدینہ شریف کے ہوتے تو تمہیں کوڑے لگواتا۔ اپنی آواز کو پست رکھو‘ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے ادب واحترام کا تقاضا ہے۔‘‘ چنانچہ فرمایا گیا کہ اگر تمہاری آواز نبی اکرم ﷺ کی آواز سے بلند ہوگئی‘ یا اگر تم رسول اللہ ﷺ سے ایسے کلام کرو جیسے عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ کر لیتے ہو تو نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔

ذرا غور کیجیے۔ ہمارے ہاں بعض مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ ’’صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ صحیح طریقے سے نہیں کہتے۔ اچھے بھلے لوگوں کو دیکھا گیا کہ کہتے ہیں: نبی صلعم۔ یہ ’’صلعم‘‘ کیا ہوتا ہے؟ ایک مہمل لفظ ہے۔ ﷺ کہنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ یہ بھی بے ادبی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث بیان کی جا رہی ہوں تو ان کو بھی توجہ سے سننا چاہیے۔ اگر اس کے دوران بے ادبی ہوگی تو بڑا گناہ کا معاملہ ہو جائے گا۔ کہیں کسی سے بحث ہوگئی‘ سامنے والے نے دلیل کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کر دی‘ تو اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بات اوپر رہے گی‘ ہماری بات نیچے رہے گی۔ ہمارے ایمان اور ادب کا تقاضا ہے کہ ہم خاموشی اختیار کر لیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی آواز سے آواز بلند ہو جائے اور ان کے سامنے کوئی بے ادبی کا معاملہ ہو جائے تو نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور احکامات کا مذاق

اڑائیں‘ سنتوں کا مذاق اڑائیں‘ داڑھی کا مذاق اڑائیں‘ پردے کا مذاق اڑائیں تو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوگا! یہ ہے ایمان کا اگلا تقاضا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ادب اور احترام بھی پیشِ نظر رہے۔ اس موضوع پر قرآنِ کریم کی حساس ترین آیت سورۃ الحجرات کی آیت ۲ ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی اطاعت

اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان کا تقاضا آپؐ کی اطاعت کرنا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کی آمادگی کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات کیا ہیں؟ آپ ﷺ قرآن لے کر آئے۔ آپ ﷺ کے ارشادات احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھیں گے‘ سمجھیں گے تو پتہ چلے گا کہ کس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا اور کس کام سے روکا گیا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر: ۷)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود حکم دے رہا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں جس بات کا حکم دیں‘ اسے مانو اور عمل کرو‘ جبکہ جس بات سے روک دیں‘ اس سے رُک جاؤ اور باز آ جاؤ۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی ہے:

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾

’’اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔‘‘

گیارہ مرتبہ تو یہ الفاظ آئے‘ البتہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (آیت ۸۰)

’’جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مجھے اور آپ کو قرآن نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مجھ سے اور آپ سے کلام نہیں کیا۔ اللہ نے رسول ﷺ کے قلب مبارک پر قرآنِ کریم کو نازل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے قرآن کی تشریح ہم تک پہنچائی۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت ہوگی تو اللہ کی اطاعت ہوگی۔ نماز کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾

’’نماز قائم کرو۔‘‘

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوْا كَما رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))(صحیح البخاری)

''نماز ایسے ادا کرو جیسے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

نماز اللہ تعالیٰ کے لیے ادا کرتے ہیں' طریقہ رسول اللہ ﷺ سے لیتے ہیں۔ یوں نماز ادا ہوگی تو اللہ کے حکم پر عمل ہوگا۔نوٹ کیجیے کہ یہ دو باتیں یعنی اللہ کا حکم رسول ﷺ کا حکم اور اللہ کی اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت' شمار میں دو باتیں ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی بات ہے۔رسول ﷺ کی مانیں گے تو اللہ کی اطاعت ہوگی' رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوگی۔ یہ دونوں باتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے عبادات کا حکم دیا ہے' حلال کمانے کا حکم دیا ہے' سچ بولنے کی تعلیم دی ہے' نکاح کی تعلیم دی ہے جبکہ اس کی تفصیلات اللہ کے رسول ﷺ نے بتائی ہیں۔ چنانچہ وہ تعلیمات سیکھیں گے تو اطاعت ہوگی۔ کامیابی کس کے لیے ہے؟ خطبہ نکاح میں جو آیات تلاوت کی جاتی ہیں ان میں سورۃ الاحزاب کی آیات ۷۰ اور ۷۱ بھی شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۷۱﴾

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ عظیم کامیابی حاصل کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں میں ہمیں بھی شامل فرمائے!

ہم سب چاہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت حاصل ہو جائے۔ یہاں حاضری نصیب ہوگئی' کل اللہ ان کی شفاعت بھی ہمیں عطا فرمائے۔ہم چاہتے ہیں ان کے ہاتھوں سے جامِ کوثر پئیں۔لمحہ فکریہ ہے کہ کچھ لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جنت میں داخل ہونے سے انکار کر دیں گے۔صحیح بخاری کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:((كُلُّ اُمَّتِیْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى))''میرا ہر اُمتی جنت میں داخل ہوگا سوائے اُس کے جس نے انکار کیا۔'' عرض کی گئی: حضور ﷺ! انکار کون کرے گا؟ فرمایا:((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰى))''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا' اور جس نے میری نافرمانی کی (میرے حکم کی خلاف ورزی کی) اُس نے انکار کیا۔'' ایسے لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم

ہو جائیں گے‘ جامِ کوثر سے محروم ہو جائیں گے‘ جنت سے محروم ہو جائیں گے۔ مجھے اور آپ کو باعمل مسلمان بننا ہے۔ یہ تب ہو گا جب ہم قرآن کی محفلوں میں بیٹھیں گے‘ جب ہم دین کی محفلوں میں بیٹھیں گے۔ جب ہم دین کو سیکھیں گے تو پتہ چلے گا یہ do's (کرنے والے کام) ہیں‘ یہ don'ts (نہ کرنے والے کام) ہیں۔ ان سے اللہ راضی ہوگا‘ ان سے اللہ ناراض ہوگا۔ اس بات کے کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور اس سے منع کیا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ حج جیسے عظیم سفر پر بھی لوگ آ گئے مگر بنیادی باتیں سیکھ کر نہیں آئے۔ طواف کے چکروں کی اور سعی کے چکروں کی صحیح تعداد نہیں پتہ۔ اللہ اکبر کبیرا! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں پوری زندگی گزارنی ہے تو ڈرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے!

رسول اکرم ﷺ کو فیصلہ ساز ماننا

ایمان کا اگلا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاملات کو رسول اللہ ﷺ کے حوالے کریں۔ ان میں اللہ کے رسول ﷺ کو فیصلہ دینے والا مانیں۔ جو فیصلے وہ فرما چکے‘ جو احکامات ہمیں عطا کر چکے ان کو دل وجان سے مان کر عمل کیا جائے‘ ورنہ ہمارا ایمان کامل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵﴾ (النساء: ۶۵)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کے رب کی قسم! یہ ایمان والے ہرگز نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے معاملات میں آپ کو فیصلہ ساز تسلیم نہ کریں‘ پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں‘ اس کے بارے میں دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں‘ اور مکمل طور پر اپنے آپ کو آپ کے حکم کے سامنے جھکا دیں۔‘‘

سود کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا۔ آج مسلمان کہہ رہا ہے کہ سود کے بغیر گزارا کیسے ہوگا! بے حیائی کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرام کیا۔ پردے کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا۔ مسلمان کاروبار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اپنی ایڈورٹائزمنٹ میں عورت کو اگر نہیں دکھائیں گے تو ہماری پروڈکٹ نہیں بکے گی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ! رمضان اگر گرمی میں آ جائے تو کہتے ہیں کہ اللہ نے یہ بڑا سخت حکم دے دیا روزے کا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاملات میں فیصلہ اللہ کے رسول ﷺ سے لو اور دل میں کوئی تنگی محسوس نہ

کرو۔ پورے طور پر اپنے آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے جھکا دو۔ جب تک یہ نہ ہو‘ تمہارا ایمان مکمل نہیں!

رسول اللہ ﷺ کا اتباع

قرآنِ کریم ایک اور لفظ ’’اتباع‘‘ استعمال کرتا ہے۔ ایک ہے اطاعت یعنی دل سے حکم ماننا۔ کرنے کا کام ہو تو اس پر عمل کرنا ہے۔ نہ کرنے والا کام ہو تو اس سے رُکنا اور باز آ جانا ہے۔ یہ کم سے کم تقاضا ہے۔ ہمارے بچے کسی تعلیمی امتحان میں ۱۰۰ میں سے ۴۰ نمبر لے آئیں تو پاس ہوں گے۔ اے لیولز والوں کے ۶۰ فیصد نمبر آئیں گے تو پاس ہوں گے۔ کیا ہم پسند کریں گے کہ بچہ ۴۰ فی صد نمبر کی تیاری کر کے امتحان دے؟ اس کے برعکس اللہ کے دین کے بارے میں ہمارا رویہ یہ ہے کہ یہ فرض تو نہیں ہے نا! اللہ کے حکم کے معاملے میں ہم ڈسکاؤنٹ اور رعایت کے بارے میں سوچتے ہیں جبکہ بچہ اپنے امتحان میں ۱۰۰ میں سے ۱۰۱ نمبر لے کر آئے۔ تنخواہ ایک لاکھ ہے تو فوراً دو لاکھ ہو جائے اور معاملہ یوں ہی آگے بڑھتا رہے۔ دنیاوی امور میں اوپر سے اوپر‘ آگے سے آگے جبکہ اللہ کے دین کے معاملے میں کم سے کم پر اکتفا کرنا؟ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر پوری طرح عمل تو ناگزیر ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآنِ پاک کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع بھی کرو۔ اللہ کی محبت کا معیار کیا ہے؟ فرمایا گیا:

﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ﴾

(آلِ عمران:۳۱)

اے نبی ﷺ! ان سے فرما دیجیے اگر تم اللہ سے محبّت کرنا چاہتے ہو‘ اللہ سے محبّت کا دعویٰ ہے تو میرا اتباع کرو‘ مجھے follow کرو‘ میرے نقشِ قدم پر آؤ۔ اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبّت فرمائے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اللہ سے محبّت کرنے کی شرط یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا اتباع کرو۔

یہ سمجھ لیں کہ اتباع کا تعلق فقط احکام سے نہیں‘ پوری زندگی سے ہے۔ پوری زندگی میں اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے پیچھے آنا۔ شادی بیاہ کے کارڈ جب اردو میں چھپتے تھے تو لکھا ہوتا تھا: نکاحِ مسنونہ‘ ولیمہ مسنونہ۔ یہ امر مستحضر رہے کہ نکاح اور ولیمے کا تعلق سُنّت سے ہے۔ اب کارڈ انگریزی میں آ گئے تو وہاں نکاحِ مسنون نہیں لکھا ہوتا۔ ہم دور چلے گئے۔ نکاح ہو تو پتہ چلنا

چاہیے کہ حضرت محمدﷺ کے کسی اُمتی کے گھر میں ہو رہا ہے۔ کیا آج مسلمانوں کے نکاح کی تقریبات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے؟ اگر میت ہو جائے تو پتہ چلے کہ مسلمان کے گھر میں کوئی فوت ہوا ہے۔ رسول اللہﷺ کے بیٹے چھوٹی عمر میں انتقال کر گئے۔ تین بیٹیاں آپﷺ کی زندگی میں بڑی ہو کر انتقال کر گئیں۔ اس اعتبار سے غور کیجیے کہ اللہ کے رسولﷺ نے تو میت کے لیے بھی ہمیں اُسوہ عطا کیا۔ اسی طرح شب و روز کے معاملات ہیں۔ لباس کا معاملہ ہے' گفتگو کے آداب ہیں' اخلاق کا معاملہ ہے' پردے کے احکامات ہیں' کاروبار کے معاملات ہیں' وراثت کے احکامات ہیں' حلال کمائی کے معاملات ہیں۔ بداخلاقی' جھوٹ اور وعدہ خلافی سے بچنے کی بات ہے۔ یہ ساری تعلیمات اللہ کے پیغمبرﷺ ہمیں دے کر گئے ہیں۔

سُنّتِ رسولﷺ کی پیروی

اللہ کے رسولﷺ نے اپنی محبّت کا معیار بھی بیان کیا۔ جامع ترمذی کی روایت ہے' اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي، وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ))

''جس نے میری سُنّت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبّت کی' اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔''

ہم اور آپ غور کریں کہ کیا آج ہمارے گھروں میں شادی بیاہ کے موقع پر' میت کے موقع پر' کاروبار کے موقع پر' لوگوں سے ڈیل کرتے ہوئے' بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اللہ کے نبیﷺ کی سُنّتوں پر عمل دکھائی دیتا ہے؟

ایک اور حدیث سمجھیے۔ اللہ کے رسولﷺ نے بہترین اہلِ ایمان (خِیَارُکُمْ) کی تعریف بایں الفاظ بیان فرمائی:

((اَلَّذِينَ اِذَا رُؤُوا ذُكِرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ)) (رواہ احمد و ابن ماجہ)

''وہ لوگ جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔''

غور کریں' کیا آج کے مسلمان کو دیکھ کر لوگوں کو اللہ یاد آتا ہے؟ ہماری گفتگو' اعمال' کردار' شب و روز کے معاملات کو دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے؟ یا پھر لوگ ہماری حرکتوں کو دیکھ کر اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس حدیث کی تشریح میں ایک جملہ عرض کر رہا ہوں کہ اُمتی وہ ہوگا جسے دیکھ کر رسول

اللہ ﷺ یاد آئیں۔ کیا آج اُمّتِ مُسلمہ کے افراد کو دیکھ کر لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ یاد آتے ہیں؟

اقامتِ دین کی جدّ و جہد

اب تک کے تمام معاملات انفرادی نوعیت کے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ بات ہے جسے انگلش میں کہتے ہیں: Never settle for less (کبھی کم پر راضی نہ ہو!) میں اس میں اضافہ کرتا ہوں کہ Rather go for the best (بلکہ بہترین کے لیے جاؤ!) خوب سے خوب تر کی تلاش، بہتر سے بہترین کی طرف توجہ! سُنّت میں خوب ترین سُنّت کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ آخری رسول کی حیثیت میں تشریف لائے۔ اللہ نے ایک مشن دیا تھا جو آج اُمّت بھول گئی۔ قرآنِ کریم تین مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے مشن کو بیان فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا الھُدیٰ یعنی مکمل ہدایت نامہ (قرآن) دے کر، The Complete Guidance دے کر، اور دِین الحقّ دے کر، مکمل نظامِ زندگی دے کر تاکہ آپ ﷺ اس دینِ حق کو تمام نظام ہائے زندگی پر غالب فرما دیں۔ سورۃ الصّف کی آیت میں آخری الفاظ ہیں:

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳﴾

''چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

یہ آیتیں آج ہمارے ہاں بیان نہیں ہوتیں۔ اول تو ہم قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں تو آرام سے بیان ہوتی ہیں۔ فضائل کی باتیں بھی آتی ہیں۔ فضیلت کے لیے نوافل ادا کرتے ہیں۔ درود شریف کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور تلاوتِ قرآن کا بھی۔ البتہ فضائل سے آگے مسائل کا بیان بھی اور مسائل سے آگے بڑھ کر نظام کا بیان بھی ہونا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ۲۳ برس کا مشن کیا ہے؟ اللہ کے عطا کردہ قرآنِ حکیم کے احکام کا نفاذ۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین کا قیام۔ حضور ﷺ کی ۲۳ برس کی جِدّوجُہد میں صرف نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نوافل، عمرہ، قربانی، تسبیحات اور صدقات وخیرات ہی نہیں ہیں بلکہ اس

جدّ و جہد کے دوران میں مکہ مکرمہ میں راستوں میں کانٹوں کا بچھایا جانا بھی ہے۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے پاس حالتِ سجدہ میں تھے تو اونٹ کی اوجھڑی جسمِ اطہر پر ڈالی گئی۔ آپ ﷺ کو مجنون اور نہ جانے کیسے کیسے برے القابات سے پکارا گیا۔ شعبِ ابی طالب میں تین سال تک آپ ﷺ کو اور آپؐ کے خاندان والوں کو محصور کر دیا گیا۔ آپ ﷺ پر دست درازی اور شہید کرنے کی ناپاک کوششیں بھی ہوئیں۔ طائف کی گلیوں میں خونِ اطہر بہا۔ مشرکینِ مکہ نے زندگی اس قدر اجیرن کر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اشک بار آنکھوں سے مکہ مکرمہ کو الوداع کہا اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ہم تو بسوں میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں مدینہ پہنچ گئے جبکہ اللہ کے پیغمبر ﷺ کئی دن تک اونٹ پر سوار رہے‘ الگ الگ راستے اختیار کیے اور مشقتوں کو جھیلا۔ مدنی زندگی کا دور آ گیا تو قتال کے احکامات بھی آ گئے۔ بدر میں بھی تلوار اٹھی‘ اُحد کا بھی میدان سجا۔ اُحد میں ۷۰ صحابہؓ شہید ہوئے‘ اللہ کے رسول ﷺ کا خونِ اطہر بہا‘ آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے‘ خود کی کڑیاں آپ ﷺ کے چہرۂ انور میں داخل ہو گئیں‘ جنہیں نکالا گیا تو خون کا فوارہ جاری ہوا‘ بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوئی۔ اُمّت کی ماں سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے پیٹ پر پتھر بھی باندھے۔ ۲۳ برس کی جِدّ و جہد کے دوران ۲۵۹ صحابہ کرام ؓ کی جانیں پیش کیں۔ تب اللہ کا دین غالب ہوا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَہَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’آپ کہہ دیجیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا‘ بے شک باطل ہے ہی مٹنے کے لیے۔‘‘

﴿وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ (النصر)

’’اور تم دیکھو گے لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔‘‘

یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا مشن‘ دعوتِ دین کا کام‘ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدّ و جہد کرنا‘ یہ آج ہم بھول گئے ہیں۔ بس مسواک کر لی‘ خوشبو لگا لی‘ داڑھی رکھ لی‘ ٹوپی سر پہ سجا لی تو سمجھا کہ سُنّت پوری ہو گئی۔ یہ سب مبارک سُنّتیں سر آنکھوں پر‘ مگر سُنّت یہاں تک محدود نہیں۔ طائف کی گلیوں میں بھی سُنّت دکھائی دے گی۔ ہجرت کی راتوں میں‘ بدر و اُحد کے میدان میں اور حنین و تبوک کے غزوات میں بھی سُنّت دکھائی دے گی۔ یہ ساری محنت

اس لیے تھی کہ اللہ کا نظام قائم ہو۔ اللہ کے احکام اُس کی زمین پر نافذ ہوں۔ یہ مشن تھا رسولِ اکرم ﷺ کا۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ ذمہ داری میرے اور آپ کے کاندھوں پر ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم رسولِ اکرم ﷺ کے اُمتی ہیں' مگر اس خوش نصیبی کے ساتھ بھاری ذمہ داری بھی ہمارے کاندھوں پر ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اور ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں!

اُمّتِ مُسلمہ کی حالتِ زار

ایک کڑوی اور سخت بات آپ کے سامنے رکھوں۔ آج زمین پر سب سے زیادہ خون کس کا بہ رہا ہے؟ مسلمانوں کا۔ پچھلے ۱۰۰ برس دیکھ لیں۔ کشمیر' فلسطین کے مسئلے کو ۸۰ برس ہونے کو آئے۔ سب سے زیادہ خون ہمارا بہا۔ افغانستان میں بہا' عراق میں بہا' برما میں بہ رہا ہے' چیچنیا میں بہا' بوسنیا میں بہا' آج فلسطین اور غزہ کی گلیوں میں بہ رہا ہے۔ بہت توجہ کیجیے گا' بڑی سخت بات ہے: کیا اللہ تعالیٰ کو ہم پر رحم نہیں آتا؟ کیا ہم اُس کے ماننے والے نہیں؟ اس کے پیغمبر ﷺ اور اُس کی کتاب کے ماننے والے نہیں؟ کیا ہم آخری اُمّت میں شامل نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اُمّت نے اُمّت والے کام کو چھوڑا' اس لیے دنیا میں ذلیل و رسوا ہے۔ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن مجید کی محض تلاوت کر کے اسے فقط سنایا نہیں بلکہ اس کو قائم اور نافذ کر کے دکھایا۔ اگر قرآن نے قصاص کا حکم دیا تو یہ حکم نافذ کر کے دکھایا۔ اگر قرآنِ کریم میں ڈاکوؤں' رہزنوں' چوروں کے بارے میں سزائیں ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے وہ نافذ کر کے دکھائیں۔ زکوٰۃ اور عشر کے احکامات حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے نافذ کر کے دکھائے۔ آج ہم روئے ارضی پر کوئی ایک ملک بتا سکتے ہیں جہاں اسلام نافذ ہو؟ اس

ملک میں بھی جہاں ہم بیٹھے ہیں‘ بینکنگ سسٹم میں سود موجود ہے۔ پاکستان میں تو ہے ہی سود کا دھندا! قرآن کہتا ہے:

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۷۹)

’’پھر اگر سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ!‘‘

جنگ کا مطلب عمومی تباہی جبکہ اللہ سے جنگ کا مطلب مکمل تباہی و بربادی۔ ایک خطہ زمین ہم دنیا کے سامنے ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ آؤ دیکھو‘ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا دیا ہوا نظام ہم نے قائم کر دیا ہے۔ آج ہماری رسوائی کی یہ وجہ ہے۔

پاکستان ہم نے کیوں بنایا تھا؟ فلموں‘ ڈراموں‘ ناچ گانوں کے لیے؟ سود کے دھندوں کے لیے؟ یہ سب کچھ بھارت میں کم ہے کیا؟ دنیاوی ترقی بھارت میں کم ہوئی ہے کیا؟ ہم نے پاکستان اس نعرے کی بنیاد پر حاصل کیا تھا: ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ اِلا اللہ!‘‘ کہاں ہے وہ لا الٰہ الا اللہ؟ زبان پر تو ہے‘ دل میں کدھر ہے؟ کیا عدالتوں میں اللہ کا دین نافذ ہے؟ بینکنگ سسٹم میں اللہ کا دین نافذ ہے؟ معیشت میں اللہ کے احکامات نافذ ہیں؟ ڈاکوؤں‘ چوروں‘ زانیوں کے لیے قرآنی سزائیں نافذ ہیں؟ زکوٰۃ اور عشر کے احکامات پر عمل درآمد ہو رہا ہے؟ ریاست کی ذمہ داری لوگوں کی کفالت کرنا ہے۔ سوشل ویلفیئر کا تصور‘ اکنامک جسٹس کا معاملہ کہاں ہے آج؟ یہ ہے آج ہماری ذلت اور رسوائی کی سب سے بڑی وجہ! ہمیں شرم آتی ہے اللہ کے رسول ﷺ کے روضے پر حاضری دیتے ہوئے۔ فلسطین والوں کے لیے دعائیں ہم نہیں کرتے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ! اُمّت کا درد ختم ہو گیا۔ ؎

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے
اُمّت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

مجھے معلوم ہے میں کڑوی بات کر رہا ہوں لیکن یہاں سے یہ احساس لے کر جانا ہے۔ اُمّت کا درد لے کر جانا ہے۔ جنت البقیع میں کم و بیش دس ہزار صحابہ کرام ؓ کی قبریں ہیں۔ ہم

سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ تو باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبریں کدھر ہیں؟ سب تو یہاں آسودۂ خاک نہیں ہیں۔ وہ مدینہ چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ کوئی افریقہ کی طرف تو کوئی ترکیہ کی طرف گیا‘ کوئی پاکستان سے آگے‘ کوئی آذربائیجان اور چین کی طرف گیا۔ یہ جملہ عجیب لگ رہا ہے کہ صحابہؓ مدینہ شریف چھوڑ کر چلے گئے۔ دراصل وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشن کو لے کر ساری دنیا میں پھیلے‘ تب آپ اور میں مسلمان ہیں۔ آج یہ قرض میرے اور آپ کے ذمے ہے۔

تنہائی میں سوچیے گا‘ دل سے بات عرض کر رہا ہوں۔ ہم یہاں پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبّت کا اظہار کر رہے ہیں‘ سلام پیش کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعائیں کر رہے ہیں کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت عطا فرما دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سامنا ہو تو جامِ کوثر میسر آئے۔ دل سے سوچیں‘ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سامنا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم سے پوچھیں: تم لے کر کیا آئے ہو؟ یا کیا دے کر آئے ہو؟ میں نے اپنا خون طائف میں دیا تھا‘ اُحد کے میدان میں دیا تھا۔ میرے گھر میں دو دو مہینے چولہا نہیں جلا تھا۔ میں نے اپنے صحابہؓ کی جانیں اللہ کی راہ میں پیش کی تھیں۔ تم کیا دے کر آئے ہو؟ خون تو بڑی بات ہے‘ کیا میرا اور آپ کا پسینا بھی اللہ کے دین کے لیے بہتا ہے؟ فاقے تو بڑی بات ہے‘ ہم اپنے آپ کو کسی فنانشل لیول پر روک کر اسی پر گزارا کرنے کی کوشش کریں اور دین کے لیے کچھ لگانے کی فکر کریں۔

ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بڑی سخت بات فرمائی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میدانِ اُحد میں تھے‘ آپؐ کا خونِ اطہر بہ رہا تھا‘ صحابہؓ کی جانیں پیش ہو رہی تھیں‘ اگر اُس وقت کوئی شخص مسجدِ نبوی میں بیٹھا تلاوت کر رہا ہوتا‘ نوافل پڑھ رہا ہوتا‘ درود و سلام کے نذرانے پیش کر رہا ہوتا‘ تو کیا اس کا ایمان معتبر ہوتا؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہاں‘ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ آج جب اللہ کا دین مغلوب ہے جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غالب کر کے گئے تھے‘ اس دین کے مغلوب ہونے کا کیا ہمیں افسوس ہے؟ آج ہمارے اسمارٹ فون کی اسکرین ٹوٹ جائے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات ٹوٹے ہوئے ہیں‘ کیا ہم واقعتاً اُمتی کہلانے کے مستحق ہیں جبکہ اللہ کے دین کے مغلوب ہونے کا ہمیں کوئی افسوس نہیں؟ اللہ کے احکامات کے ٹوٹنے کا کوئی افسوس نہیں! ہماری گاڑی کا شیشہ ٹوٹ جائے تو افسوس ہوگا۔ ڈنر سیٹ میں سے کوئی ایک چیز ٹوٹ

جائے تو ہمیں افسوس ہوگا۔ اللہ کا دین پامال ہے‘ دین کے احکامات ٹوٹ رہے ہیں لیکن ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس پوری کائنات میں سب سے زیادہ قیمتی جان اور سب سے زیادہ قیمتی خون اللہ کے رسول ﷺ کا ہے۔ وہ جان اللہ کے دین کی دعوت کے کام میں لگی رہی۔ صرف انفرادی عبادات میں نہیں‘ اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد میں زندگی لگی۔ میری اور آپ کی جان تب قیمتی ہوگی جب اللہ کے دین کی دعوت کے کام میں میرا اور آپ کا وقت لگے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا: ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا‘ لوح و قلم تیرے ہیں!

اس اُمّت کے بہت سارے مسائل ہیں لیکن حل ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۷﴾ (محمد)

’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی نصرت کرو گے (اس کے دین کی مدد کرو گے‘ اس کے رسولؐ کے لائے ہوئے دین کی جدوجہد کرو گے) تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔‘‘

اسی کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا کہ اللہ کا دین غالب کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ دورِ ملوکیت میں اسلام کے روشن چہرے پر جو پردے پڑ گئے تھے‘ ہمیں اُن کو ہٹانے کا موقع میسر آئے گا۔ شریعت نافذ ہو جائے گی تو دنیا کے مسائل کا حل میسر آئے گا۔ اسی کو قائداعظم نے کہا تھا کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کو غلام بنا چھوڑا‘ اب ہمارا فرض ہے کہ خلافت راشدہ کا رول ماڈل دنیا کے سامنے رکھیں اور دورِ جدید کی اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کریں۔ یہ ہماری ویژن کی کلیرٹی تھی جب ہم نے پاکستان حاصل کرنا چاہا تھا۔

آخر میں ایک حدیث پیش کرتا ہوں‘ جسے دل کے کانوں سے سنیے گا۔ ٹیلی ویژن کے ایک مشہور پروگرام میں ہم بھی شامل تھے۔ اینکر نے سوال کیا: کیا اچھا ہوتا اگر ہم اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں ہوتے؟ میں نے عرض کیا: بھائی یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ کب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آنا تھا‘ اللہ کا فیصلہ ہے۔ کب مجھے اور آپ کو دنیا میں آنا تھا‘ اللہ کا

فیصلہ ہے۔ اس میں آپ کا‘ میرا کوئی اختیار نہیں۔ ہم ماضی میں واپس نہیں جا سکتے۔ البتہ آنے والے کل کے بارے میں آپ کو ایک حدیث سنائے دیتا ہوں۔ یہ بہت بڑا تحفہ ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ حدیث کی اوّلین دور کی کتب میں سے ہے۔ اس میں یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا:

((يَا لَيْتَنِي لَقِيْتُ إِخْوَانِي))

’’اے کاش! میری ملاقات میرے بھائیوں سے ہو جائے۔‘‘

صحابہؓ نے عرض کیا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَلَسْنَا اِخْوَانُكَ وَ اَصْحَابُكَ؟

’’اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ہم آپؐ کے بھائی اور آپؐ کے ساتھی نہیں؟‘‘

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((بَلٰى، وَلٰكِنْ قَوْمٌ يَجِيْئُوْنَ مِنْ بَعْدِكُمْ))

’’ہاں بالکل! لیکن میں ان لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو تمہارے بعد آئیں گے۔‘‘

اب تین باتیں آ گئیں۔ فرمایا:

((يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ، وَ يُصَدِّقُوْنِيْ تَصْدِيْقَكُمْ، وَ يَنْصُرُوْنِيْ نَصْرَكُمْ))

’’وہ مجھ پر ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو‘ اور میری تصدیق کریں گے جیسے تم نے میری تصدیق کی ہے‘ اور میری مدد کریں گے جیسے تم نے میری مدد کی ہے۔‘‘

((فَيَا لَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ))

’’پس کاش! میری ملاقات میرے بھائیوں سے ہو جائے۔‘‘

یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش ہے۔ ہم چاہتے ہیں آپؐ سے ملیں۔ ہم چاہتے ہیں آپؐ کی شفاعت ملے‘ آپؐ کے ہاتھوں جامِ کوثر پینا ملے‘ جنت الفردوس میں آپؐ کا پڑوس ملے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے ملنا چاہتے ہیں‘ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خواہش کا اظہار کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس کام میں ہماری نصرت درکار ہے؟ گھر کے لیے‘ جائیداد کے لیے‘ کاروبار کے لیے؟ قطعاً نہیں! وحی کا آغاز ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کاروبار ختم‘ تجارت ختم۔ اب دعوتِ دین اور نفاذِ دین کی جدّوجُہد شروع ہوئی۔ ۲۳ برس کا مشن ہمارے سامنے ہے۔ دعوتِ دین کے کام میں‘ قرآن کو پھیلانے کے کام میں‘

اللہ کے دین کو قائم کرنے کے کام میں‘ اللہ کے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں ہماری نصرت مطلوب ہے۔ وہ جو سورۂ محمد (آیت ۷) میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ (کے دین) کی نصرت پر لگو گے تو اللہ تمہاری نصرت کرے گا۔ یہ بھی ارشاد ہوا:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ١٥٧﴾ (الاعراف)

’’پس جو اُس (رسول نبی اُمی ﷺ) پر ایمان لائیں گے‘ آپؐ کی تعظیم کریں گے‘ آپؐ کی حمایت و نصرت کریں گے اور اُس نور کی پیروی کریں گے جو آپؐ کے ساتھ نازل کیا جائے گا وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔‘‘

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت عطا فرمائے۔ دل سے آپ ﷺ کی ذات پر ایمان عطا فرمائے۔ آپ ﷺ کا ادب اور احترام نصیب فرمائے۔ آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ جو مبارک کام حضور ﷺ نے ۲۳ برس میں سرانجام دیا‘ مجھے اور آپ کو کرنے کی توفیق دے تو کل شرمندگی نہیں ہوگی‘ ذلت و رسوائی نہیں ہوگی۔ اگر ہم یہ کام نہیں کر رہے تو سوچنا چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا سامنا کیسے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس دن کی ذلت و شرمندگی سے بچائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین!

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

سُوْرَةُ الْبَقَرَة (۱۱)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فرمایا: ﴿وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ﴾ ’’اور یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ مَیں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔‘‘

خلیفہ کا مفہوم

مفسّرین نے لفظ ’’خلیفہ‘‘ کے لفظ پر بڑی بحث کی ہے۔ ویسے تو یہ خلف (پیچھے) سے ہے۔ اس اعتبار سے خلیفہ کا مفہوم ہے: پیچھے آنے والا‘ جانشین۔ یعنی خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کے بعد اُس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اُس کی جگہ لے‘ لیکن اس کا استعمال بالعموم اُس شخص کے لیے ہوتا ہے جس کو کسی کی طرف سے کسی وجہ سے نیابت دے دی جائے۔ چنانچہ کسی شخص یا کسی ہستی کا انتقال ہو جائے اور اُس کی جگہ پر اُس کا جانشین آ جائے تو وہ اُس کا خلیفہ ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی وجہ سے معزول ہو جائے اور اپنی زندگی ہی میں کسی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دے۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ زمین میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت‘ معاذ اللہ‘ اللہ تعالیٰ کے غائب ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ تو ہر جگہ‘ ہر آن موجود ہے۔ وہ الحی القیوم ہے۔ وہ زندۂ جاوید ہے‘ اُس پر موت وارد ہونے والی نہیں ہے۔ پھر معاذ اللہ! اسے کوئی عجز یا کمزوری لاحق نہیں ہے۔ مزید برآں‘ کسی ہستی کے مقام و مرتبہ کے اظہار کے لیے بھی لفظ خلیفہ استعمال ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ذُریتِ آدمؑ کے خلیفہ قرار دیے جانے کا اصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ غائب نہیں ہے‘ حاضر ہے: ﴿وَ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ﴾ (الحدید: ۴) لیکن اُس

نے ایک پردۂ غیب حائل کر دیا ہے‘ جس کے اِس طرف اُس نے انسان کو خلافت عطا فرمائی ہے‘ اُسے نیابت دی ہے‘ اُسے اختیار دیا ہے‘ کچھ autonomy دی ہے۔ یہ آدم وذُریتِ آدم کا مقام ہے‘ یہ منصب اس کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس ضمن میں دو بحثیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً﴾ تو اس سے کیا مراد ہے؟ آیا شخص آدم یا ذُریتِ آدم؟ ایک رائے یہ ہے کہ ذُریتِ آدم یا نسلِ آدم مراد ہے‘ شخصِ آدمؑ نہیں۔ اس لیے کہ یہاں آدم کا لفظ نہیں آیا۔ وہ آگے آئے گا: ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا﴾‘ یہاں پر مجرد خلیفہ کا لفظ آیا ہے۔ البتہ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر خلیفہ سے ذاتی طور پر حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ دوسری بحث یہ کہ خلافت کس معنی میں ہے؟ آج کل بھی بعض لوگ یہ رائے پیش کر رہے ہیں اور ہماری بزرگ شخصیات میں سے امام ابن تیمیہؒ اور اہلِ علم کے ایک حلقہ کی یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کا کیا سوال! وہ تو ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔ اُس کو تو (معاذ اللہ!) نہ موت آئی ہے اور نہ آئے گی۔ لہٰذا اللہ کا خلیفہ چہ معنی دارد؟ گویا اُن کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام یا ذُریتِ آدمؑ کے خلیفۃ اللہ ہونے کا تصور ہی غلط ہے‘ بلکہ وہ تو اسے شرک وکفر تک قرار دیتے ہیں۔

البتہ قرآن مجید کی تفسیر میں اس طرح کے معاملات میں ہمیں سلف کی طرف رجوع کرنا ہے اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر ان چیزوں کا جاننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ کوئی مادّی علوم نہیں ہیں‘ بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جو بذریعہ وحی ہی معلوم ہو سکتے ہیں‘ جس کا منبع وسرچشمہ ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے‘ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے براہِ راست اور اوّلاً اکتساب کرنے والے صحابہ کرامؓ ہیں۔ اس معاملے میں صحابہ کرامؓ سے جو اقوال منقول ہوئے ہیں‘ ان میں بھی دو رائیں موجود ہیں۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہاں ’’خلیفہ‘‘ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اگرچہ یہاں صراحت نہیں ہے۔ الفاظ ہیں: ﴿اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً﴾ ’’مَیں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔‘‘ یعنی مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زمین میں

ایک خلیفہ بناؤں۔ ’’جَاعِل‘‘ اسم الفاعل ہے۔ اس میں ایک عزیمت‘ پختہ ارادہ اور فیصلہ کا مفہوم ہوتا ہے۔ اسی لیے مَیں نے الفاظِ قرآنی کی ترجمانی بایں الفاظ کی ہے کہ ’’مَیں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ زمین میں ایک خلیفہ بناؤں۔‘‘ لیکن یہ وضاحت نہیں ہے کہ اپنا خلیفہ بناؤں یا کسی اور کا خلیفہ!

جہاں تک اس مقام کے متن کا تعلق ہے تو دونوں امکانات موجود ہیں۔ چنانچہ ہمیں سلف میں بھی یہ دونوں اقوال ملتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ زمین پر جِنّات پہلے سے موجود تھے‘ جن میں شر کا عنصر غالب ہے اور انہوں نے یہاں سرکشی مچائی۔ اس اعتبار سے کہا گیا کہ ان کو یہاں سے بے دخل کر کے ان کے بعد میں آنے والے آدم اور ذُریتِ آدم کو یہاں بسایا گیا۔ تو گویا وہ جِنّات کے خلیفہ ہوئے۔ یہ ایک رائے ہے جو سلف میں بھی موجود ہے۔ البتہ صحابہ کرام ؓ میں دوسرا قول زیادہ مقبول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کا خلیفہ بنایا گیا۔ چنانچہ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ مفسّرین و اسلاف نے اس ضمن میں دو امکانات کا اظہار کیا ہے۔

الأول: بأنه تعالى لما نفى الجن من الأرض وأسكن آدم الأرض كان آدم عليه السلام خليفة لأولئك الجن الذين تقدموه. يروى ذلك عن ابن عباس.

’’پہلا امکان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنات کو زمین سے بے دخل کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو یہاں آباد کیا تو حضرت آدم علیہ السلام گویا جِنّات کے خلیفہ ہوئے جو ان سے پہلے یہاں آباد تھے۔ یہ روایت کیا گیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے۔‘‘

الثاني: إنما سماه الله خليفة لأنه يخلف الله في الحكم بين المكلفين من خلقه وهو المروي عن ابن مسعود وابن عباس والسدي وهذا الرأي متأكد بقوله: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾

’’دوسرا احتمال و امکان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ کا نام اس لیے دیا ہے کہ وہ (زمین میں) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے مابین فیصلے کرنے میں اللہ

کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔ اور یہ دوسرا قول ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور سدیؒ سے مروی ہے۔ یہ (مؤخر الذکر) رائے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے مضبوط ہو جاتی ہے: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (صٓ) اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین کی خلافت عطا کی ہے، پس تم لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

یعنی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دونوں قول مروی ہو گئے۔ اس طریقے سے جو اقوال منسوب ہو جاتے ہیں، ان میں امکان ہوتا ہے کہ ان کی پہلے کوئی ایک رائے ہو، پھر انہوں نے اپنی رائے بدلی ہو۔ اُن کے کسی شاگرد کے علم میں وہی پہلی رائے ہو اور اُس نے وہی آگے منتقل کر دی ہو، جبکہ کسی دوسرے شاگرد کے علم میں اُن کی دوسری رائے ہو اور اُس نے وہ رائے نقل کی ہو۔ اس اعتبار سے اس بارے میں کوئی تشویش کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کی طرف دو اَقوال کیسے منسوب ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اگرچہ علمِ تفسیر میں بہت اونچا مقام ہے لیکن وہ نوجوان صحابہؓ میں سے ہیں، جب کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کبارِ صحابہؓ (بزرگ صحابہؓ) میں سے ہیں اور انہوں نے تیقّن کے ساتھ کہا ہے کہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے۔ امام رازیؒ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ یہ دوسری رائے موکد ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا گیا۔

اصل میں تو حکم دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف: ۴۰) لیکن نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذُرّیت کو دیا ہے، اسی لیے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں۔ ہمارے ائمہ مفسّرین میں سے ابن جریر، معالم، بحر، بیضاوی، اور بڑی بڑی جو اُمّ التفاسیر ہیں سب کے اندر یہ رائے موجود ہے۔ تاہم ہمارے بزرگوں اور ائمہ میں سے چند ایک نے جن میں امام ابن تیمیہ بھیؒ ہیں، اس رائے سے اختلاف کیا ہے، لیکن اور بھی بہت سے معاملات میں ان کی شاذ آراء ہیں جن سے جمہور مفسّرین اتفاق نہیں کرتے۔ ہر ذہین اور genious آدمی کی کوئی نہ کوئی ایسی بات

ہوتی ہے جس میں وہ دوسروں کے ساتھ موافقت نہیں کرتا‘ جسے ’’شاذ رائے‘‘ کہا جاتا ہے۔ البتہ اصل اہمیت اُسی رائے کی ہوتی ہے کہ جس پر اِجماع ہو‘ یا جس پر اکثر اہلِ علم نے اتفاق کرلیا ہو‘ اور اسی کو قبول کیا جانا چاہیے۔

قرآن میں خلافتِ آدمؑ کے اشارات

اس ضمن میں قرآن مجید سے راہنمائی لی جائے تو مکی قرآن میں چار ایسے اسلوب اختیار کیے گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں یہ خلافت‘ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے سوا کوئی اور خلافت نہیں بن سکتی۔ قرآن حکیم میں حضرت آدم علیہ السلام کا مقام اس اعتبار سے اجاگر ہوکر سامنے آتا ہے کہ تمام فرشتوں کو اُن کے سامنے سجدہ کرایا گیا۔ تمام مخلوقات کا اصل مسجود تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے‘ لیکن تمام فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کرنا یہ ثابت کررہا ہے کہ اللہ کے بعد مقام حضرت آدمؑ کا ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ واقعہ اس قدر اہم ہے کہ قرآن حکیم میں سات مرتبہ اس کا تذکرہ کیا گیا۔ دو مقامات (الحجر:۳۰، صٓ:۷۳) پر تو یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾۔ اس جملے میں تاکید کے سب اسلوب جمع کردیے گئے ہیں۔ اَلْمَلٰٓئِکَۃُ میں بھی لام حصر کا ہے‘ یعنی تمام فرشتے۔ کُلُّھُمْ ان میں سے سب کے سب۔ اَجْمَعُوْنَ سب کے سب جمع ہوکر‘ یک بارگی‘ ایک جماعت کی صورت میں‘ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ اسی لیے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ذُریتِ آدمؑ میں سے ہیں۔ یہاں آدمؑ کو ہم ایک نوع کی حیثیت سے لے رہے ہیں کہ اس کائنات کے اندر جملہ مخلوقات میں باقی سب سے اشرف اور افضل حضرت آدم علیہ السلام اور ذُریتِ آدمؑ ہے۔

اسی طرح فرمایا: ﴿....لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (صٓ:۷۵) ’’.... جس کو مَیں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا۔‘‘ اللہ تعالیٰ کے ہمارے جیسے دو ہاتھ تو نہیں ہیں۔ چنانچہ یوں کہا جائے گا کہ اس سے مراد ہے کہ مَیں نے آدمؑ کو بڑے اہتمام سے بنایا ہے‘ لیکن میرے نزدیک اس کی صحیح ترین تعبیر یہ ہے کہ عالَمِ امر اور عالَمِ خلق دونوں اللہ تعالیٰ کی ذات کے قبضۂ قدرت میں ہیں: ﴿اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:۵۴) اور یہ دونوں

عالمِ مخلوقات میں سے صرف آدمؑ میں آ کر جمع ہو گئے ہیں۔ اس کی روح عالمِ امر سے ہے اور اس کا یہ جسدی و مادّی وجود عالمِ خلق سے ہے۔ اگر یہ دونوں عالم جمع ہوئے ہیں تو وہ صرف ایک مخلوق انسان ہے‘ وگرنہ ملائکہ صرف عالمِ امر کی شے ہیں‘ اور جِنّات صرف عالمِ خلق کی شے ہیں‘ ان میں وہ روح نہیں پھونکی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح کا پھونکا جانا ہی درحقیقت حضرت آدم علیہ السلام کے شرف اور مقام و مرتبہ کو واضح کرتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الحجر (آیت ۲۹) اور سورۂ صٓ (آیت ۷۲) دونوں جگہ ایک جیسے الفاظ آئے ہیں:

﴿فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ۝۲۹﴾ ’’تو جب میں اس کو پوری طرح درست کر دوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں تو اس کے سامنے گر پڑنا سجدہ کرتے ہوئے۔‘‘ اس کے بعد دونوں مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ۝۳۰﴾

پھر یہ کہ آدمؑ و ذُریتِ آدمؑ کی فضیلت بایں طور بیان فرمائی:

﴿وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا ۝۷۰﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور ہم نے بڑی عزّت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں‘ اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا‘ اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر‘ بہت بڑی فضیلت۔‘‘

نوٹ کیجیے کہ سورۂ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع میں قصۂ آدم و ابلیس کے فوراً بعد یہ آیت آئی ہے کہ بنی آدم کو ہم نے بڑا اعزاز بخشا‘ ان کی ہم نے بڑی تکریم کی ہے۔

مزید یہ کہ اگرچہ قرآن مجید میں تو یہ مضمون موجود نہیں ہے لیکن تورات میں آیا ہے:

"So God created man in His own image ."

(Genesis 1 : 27)

جبکہ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُورَتِهِ)) (متفق علیہ) ’’اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا۔‘‘ اس سے مراد یہ شکل و صورت اور یہ جسم

نہیں ہے‘ یہ خدوخال نہیں ہیں۔ اس کی تاویل یہی ہے کہ خلق اور امر دونوں کو جمع کر دیا گیا۔ درحقیقت اللہ کی ذات میں اختیار کے اعتبار سے جمع ہیں خلق بھی اور امر بھی‘ اور انسان کے وجود میں آ کر یہ دونوں عالَم جمع ہو گئے ہیں۔

پھر مدنی سورتوں میں سے سورۃ الاحزاب میں یہ منفرد اندازِ بیان آیا ہے:

﴿اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿۷۲﴾﴾

’’ہم نے اِس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر‘ تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے‘ اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا نادان تھا۔‘‘

یہاں بھی استعاراتی انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی امانت آسمانوں پر‘ زمین پر‘ پہاڑوں پر‘ ہر شے پر پیش کی لیکن سب اس بارِ امانت کو اٹھانے سے ڈر گئے‘ سب نے گھبرا کر انکار کیا‘ لیکن انسان نے اس بار کو اٹھا لیا۔ بقول حافظ شیرازی ؎

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ کار بنامِ منِ دیوانہ زدند!

’’آسمان اس امانت کا وزن نہ اٹھا سکا‘ بالآخر اسے اٹھانے کا قرعہ مجھ دیوانے (حضرت انسان) کے نام نکلا۔‘‘

میرے نزدیک اللہ کی امانت سے مراد یہاں وہ ’’روح‘‘ ہے جو انسان کے حیوانی وجود میں اللہ تعالیٰ نے بطور خاص پھونک رکھی ہے ﴿وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾۔ یہ انسان کے اکرام واعزاز اور اس کے مسجودِ ملائک بننے کی اصل بنیاد ہے۔

تخلیقِ آدمؑ اور تصوّرِ ارتقاء

میرا اپنا ذاتی رجحان تخلیقِ انسانی میں ارتقاء (evolution) کی طرف ہے اور اس پر کچھ گفتگو آیت ۲۸ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔ واضح رہے کہ ارتقاء کے نظریات ہمارے اسلاف میں مولانا روم (۱۲۰۷۔ ۱۲۷۳ء)‘ ابن مسکویہ (۹۳۲۔ ۱۰۳۰ء) اور دیگر

مفکرین اور حکماء نے پیش کیے تھے۔ تب ڈارون کے تو آباء واَجداد کا بھی کہیں وجود نہیں تھا' وہ تو کل کی شے ہیں۔ مولانا روم تو کہتے ہیں ؎

ہفت صد و ہفتاد قالب دیدہ ام

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام!

یعنی مَیں سات سو اسّی پیکر تو پہلے ہی بیت آیا ہوں۔ کبھی مَیں جمادات میں تھا' پھر نباتات میں' پھر حیوانات میں آیا۔ ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچا۔ مجھے کیا اندیشہ ہے کہ موت مجھ میں کچھ کمی کر دے گی! میرے لیے موت کا کیا سوال! یہ بات تو مسلّم ہے کہ ہمارے لیے موت کا تصور فنا ہو جانا نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انسانی حیات کا کوئی اختتام (end) ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ اہلِ سُنّت کے نزدیک جنت اور دوزخ دونوں ابدی ہیں۔ چاہے اُدھر گئے' چاہے اِدھر گئے۔ [امام ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ عربیؒ کی شاذ رائے ہے کہ جہنم ابدی نہیں ہے' ایک وقت آئے گا کہ وہ ختم ہو جائے گی' جبکہ جنت ابدی ہے' ہمیشہ رہنے والی ہے۔]

قرآن مجید کا ایک مقام ایسا ہے جو اس تصورِ ارتقاء کی بھرپور تائید کرتا ہے۔ وہ مقام سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱ ہے' جہاں جمع کے صیغہ سے بات شروع کی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ﴾ ''ہم نے تمہیں پیدا کیا'' ﴿ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾ ''پھر تمہاری تصویر کشی کی'' تمہارا نقشہ بنا دیا' تمہارے خدوخال بنا دیے' تمہاری صورت گری کی۔ ﴿ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ ''پھر ہم نے کہا فرشتوں سے کہ جھک جاؤ آدم کے سامنے!'' یہاں یہ نہیں کہا کہ ہم نے آدم کو بنایا' اُس کی صورت گری اور پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ جھک جاؤ آدم کے سامنے۔ یہاں جمع کے صیغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نوع (Homo sapiens) پہلے وجود میں آئی' اور اس نوع میں سے ایک چنیدہ فرد (selected individual) حضرت آدم علیہ السلام کا انتخاب ہوا ہے' جس کے لیے اب واحد کا صیغہ آ رہا ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ ''پھر جب مَیں اُس کی پوری طرح نوک پلک سنوار دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں.....''

پوری نوع میں سے جس فردِ واحد کو اللہ تعالیٰ نے چُنا ہے اور اُس کے اندر اپنی طرف سے روح کو پھونکا ہے اب وہ حضرت آدمؑ بن گیا ہے‘ اب وہ نرا Homo sapiens نہیں ہے۔

یہ بالکل ممکن ہے‘ جیسے زمین پر کئی بڑی بڑی انواع (species) بالکل معدوم ہوگئیں۔ ڈائنوسارز وغیرہ کے بڑے بڑے متحجر اجسام (fossils) نکلتے ہیں لیکن اب ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اسی طرح کچھ بعید نہیں کہ حضرت آدمؑ سے پہلے کی پوری کی پوری نوع ہی ختم ہوگئی ہو۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ جو اُس وقت کی ارتقا یافتہ (evolved) نوع کے ایک فردِ واحد تھے‘ جن کو اللہ نے چنا‘ پھر ان میں روح پھونکی‘ انہی سے پوری نسلِ آدمؑ وجود میں آئی۔ اس میں قطعاً کوئی شے مستبعد اور خارج از امکان نہیں‘ نہ عقلی اعتبار سے‘ نہ سائنسی اعتبار سے اور نہ قرآنی اعتبار سے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾

”یقیناً اللہ نے چُن لیا آدمؑ کو‘ نُوحؑ کو‘ آلِ ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو تمام جہان والوں پر۔“

ان الفاظِ قرآنی کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اللہ نے چُنا ہے۔ ظاہر ہے ایک فرد کو کسی مجموعے کے اندر سے چُنا جاتا ہے۔ کوئی گلاب کا پودا ہے‘ اُس میں دس پھول لگے ہوئے ہیں‘ کسی کا دستِ حنائی اُن میں سے ایک پھول کو چُن لیتا ہے تو یہ اُس پھول کی قسمت ہے۔ یہ ہے ”اِصطِفاء“ یعنی پسند کرلینا‘ چن لینا۔ چنانچہ اس آیت میں لفظ ”اِصطِفاء“ کا حضرت آدم علیہ السلام پر اطلاق ہوا ہے۔ غور کیجیے اگر اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیمؑ کو چُنا ہے تو پوری نوعِ انسانی میں سے چُنا ہے۔ کتنی ہی نسلیں تھیں جن میں سے آلِ ابراہیمؑ چنے گئے۔ عین ممکن ہے اسی طریقے سے حضرت آدم علیہ السلام کو چُنا گیا ہو۔ یہ نظریات امکان کے درجے میں رکھ رہا ہوں‘ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ تصورات قرآن کے بیان کے ساتھ ہم آہنگ (compatible) نہ ہوں‘ یا اس سے موافقت (reconcile) نہ کر سکتے ہوں۔ باقی

کسی کا تصور یہ ہو کہ زمین سے مٹی آسمان پر لے جائی گئی‘ پھر مجسمہ بنا کر اس میں پھونک ماری گئی‘ وہاں سے پھر اُن کو نیچے اتارا گیا تو قرآن مجید کی رو سے اس کا بھی امکان موجود ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید کے اعجاز کا بہت اہم پہلو ہے کہ اصل بات ایک عام آدمی کی ذہنی سطح پر بھی پہنچ جاتی ہے اور اعلیٰ علمی وعقلی سطح پر بھی۔ اصل بات جو ہر ایک کو سمجھانی مقصود ہے وہ یہ کہ تمہارا خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اُس نے تمہیں بنایا‘ وہ تمہارا مالک ہے اور تمہیں اُسی کے پاس واپس بھی جانا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ باقی یہ کہ کیسے بنایا‘ کن مراحل اور مدارج میں بنایا‘ کس شے سے بنایا‘ اس بارے میں غور وفکر کا میدان کھلا چھوڑ دیا۔ قرآن کی وسعتِ معانی کا اندازہ لگایئے کہ انسان کے مادۂ تخلیق کے لیے صرف ’’تُراب‘‘ نہیں کہا‘ بلکہ مختلف مقامات پر پانچ مختلف تعبیرات اختیار کی گئیں۔ آخر اس میں کوئی حکمت ہے‘ اہلِ علم کے لیے اشارے ہیں۔ اسی میں وہ بات مضمر ہے کہ جب تمہارا علم بڑھے گا‘ تم ان چیزوں کو سمجھو گے تب تم پر یہ حقیقت اور مبرہن ہو جائے گی:

﴿سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

’’عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی‘ یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔‘‘

ہم انہیں آسمانوں اور زمین میں اور خود ان کی اپنی جانوں میں نشانیاں دکھائیں گے‘ یہاں تک کہ حقیقت ان پر پوری طرح منکشف ہو جائے گی‘ ان پر یہ بات مبرہن ہو جائے گی کہ یہ قرآن سرتاسر حق ہے۔ اس میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے وہ سب کا سب صحیح اور درست ہے۔ اس اعتبار سے ہم ابھی اس رکوع کی پہلی آیت (۳۰) کے ایک ٹکڑے کا مطالعہ ہی کر سکے ہیں۔ بہرحال اس رکوع کے تمہیدی مضامین کسی حد تک بیان ہو گئے ہیں۔

فرشتوں کا اشکال اور اس کا مسکت جواب

﴿قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ ’’انہوں نے کہا: (اے پروردگار!) کیا آپ بنائیں گے اِس (زمین) میں (خلیفہ) اُس کو جو اِس

میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟‘‘

اس ضمن میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آدمؑ یا اُس کی ذُرّیت زمین میں فساد کرے گی؟ اس کا سیدھا سا بالکل تشفّی بخش جواب یہ ہے کہ لفظ خلیفہ میں یہ شے مضمر ہے کہ اُسے خود ارادی اور خود مختاری (autonomy) دی جائے گی‘ اور جہاں اختیار ہو وہاں اُس کے صحیح استعمال ہونے کے امکان کے ساتھ غلط استعمال ہونے کا امکان بھی موجود رہتا ہے (Authority tends to corrupt...)۔ فرشتے تو وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے‘ اس لیے کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ اہلِ سُنّت کا مجمع علیہ عقیدہ یہی ہے۔ لہٰذا فساد کا کوئی سوال نہیں۔ پھر یہ کہ اس سے قبل زمین پر جِنّات بھی آباد رہے‘ اور ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک اختیار اور ارادہ رکھا تھا۔ ان کا مکلّف وجود ہے جس میں خیر اور شر دونوں کا امکان ہے۔ انہوں نے یہاں پر خون ریزی کی اور فساد بھی مچایا‘ تو انہی پر قیاس کرتے ہوئے فرشتوں نے کہا کہ اگر آدمؑ کو خلافت دی جائے گی اور اسے اختیار دیا جائے گا تو یہ زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی بھی کرے گا۔

﴿وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ ’’جبکہ ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔‘‘

واوٗ یہاں حالیہ ہے بمعنی جبکہ‘ درآنحالیکہ۔ فرشتوں نے عرض کی: پروردگار! زمین میں کسی کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے‘ درآنحالیکہ ہم آپ کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں حمد کے ساتھ اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔ یہاں دو الفاظ جمع ہو کر آئے ہیں: تسبیح اور تقدیس۔ ان دونوں کا مشترک ترجمہ تو پاکی بولنا‘ پاکی بیان کرنا کیا جاتا ہے‘ لیکن دونوں کو الگ الگ سمجھ لیجیے۔ تسبیح کا مادہ ’’س ب ح‘‘ ہے۔ سَبَحَ یَسْبَحُ (فعل لازم) کے معنی ہیں تیرنا۔ اگر کوئی شے پانی میں تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہو تو ڈوبے گی نہیں‘ اپنی سطح پر برقرار رہے گی۔ اسی طرح اگر وہ خلا میں تیزی سے حرکت کر رہی ہے تو اپنے مدار میں اپنی

سطح پر برقرار رہے گی۔ چنانچہ اس کے مفہوم میں تیزی اور گرم جوشی کے ساتھ ایک حرکت ہے۔ ’’سبح‘‘ سے باب تفعیل میں سَبَّحَ یُسَبِّحُ آتا ہے‘ یعنی کسی شے کو تیرانا۔ کسی شے کو اُس کی اصل جگہ پر‘ اُس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ یہ اس کا لغوی مفہوم ہے۔ اللہ کی تسبیح کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جو مقامِ بلند ہے‘ اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا تصور اُس کی ذات یا صفات کے ساتھ شامل نہ ہو جائے جو اُس کے شایانِ شان نہ ہو اور اس کے مقام سے فروتر ہو۔ اللہ تعالیٰ کو اُس کے اصل مقامِ رفیع پر برقرار رکھنا اللہ کی تسبیح ہے۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے‘ ہر عیب سے‘ ہر نقص سے‘ ہر کوتاہی سے اعلیٰ‘ ارفع‘ منزّہ اور مبرّا ہے۔ یہ تسبیح ہے۔ اس لفظ (سَبَحَ) کے اندر جو سرگرم ہونا کا مفہوم شامل ہے اس کے اعتبار سے کسی کے حکم کی بجا آوری میں اس درجے سرگرمی دکھانا کہ اُس کا ہر حکم واجب الاطاعت ہو جائے۔ تسبیح کا اصل مفہوم یہ ہے جو اسے تقدیس سے علیحدہ کرتا ہے۔ تقدیس کا مفہوم کسی ہستی کی بڑائی‘ بزرگی‘ اُس کے ہر عیب و نقص سے پاک ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوئے زبان سے اس کا اقرار کرنا ہے۔ اس میں اعتقاد اور فکری عنصر زیادہ ہے۔ تسبیح اپنے عمل اور اپنے رویے سے کسی کی بزرگی‘ اُس کی عظمت‘ اُس کے اختیار‘ اُس کے اقتدار کو تسلیم کرنا اور اُس کے سامنے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے رہنا ہے۔ فرشتوں کا یہ اقرار تھا کہ ہم آپ کی تمام مشیتوں‘ تمام ارادوں‘ اور تمام فرامین واحکام کو سرگرمی کے ساتھ بجا لا رہے ہیں‘ حمد کے ساتھ‘ شکر کے ساتھ۔ گویا ہم شکر ادا کر رہے ہیں کہ آپ کے حکم کو بجالانے کا موقع ملا۔

منّت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

(بادشاہ پر احسان نہ رکھو کہ تم اُس کی خدمت بجالا رہے ہو‘ بلکہ اُس کا احسان مانو کہ اُس نے تمہیں خدمت کے لیے قبول کرلیا ہے۔)

ہم آپ کا شکر ادا کرتے ہوئے‘ آپ کا احسان مانتے ہوئے‘ آپ کی حمد کے ترانے الاپتے ہوئے‘ آپ کے احکامات کی بجا آوری میں پوری طرح سرگرم ہیں اور آپ کی تسبیح

وتقدیس کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں تو اس ضرورت کا کوئی احساس نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے آدمؑ کو خلافت دی جائے‘ اس کو خلیفہ معیّن اور مقرر کیا جائے۔

﴿قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ ’’(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: مَیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔‘‘ (جاری ہے)

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم، ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

واضح رہے کہ ’’درسِ قرآن‘‘ کا یہ سلسلہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہونے والے مفصل دروسِ قرآن پر مشتمل ہے جو ۱۹۹۱ء میں شروع ہوئے۔ بعض قارئین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ’’بیان القرآن‘‘ کی قسط وار اشاعت ’’میثاق‘‘ میں دوبارہ شروع کر دی گئی ہے۔ ’’بیان القرآن‘‘ کی اشاعت فروری ۲۰۲۵ء کے شمارے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی اور اس سے اگلے شمارے (مارچ ۲۰۲۵ء) سے ان صفحات میں ڈاکٹر صاحبؒ کے مفصّل دروسِ قرآن کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اسی شمارے کے ص ۲۸ پر ان مفصّل دروسِ قرآن کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی تھی۔ پیش نظر ’’درسِ قرآن‘‘ کی ترتیب وتدوین نہایت عرق ریزی سے کی جا رہی ہے اور یہ ذمہ داری مدیر شعبہ مطبوعات حافظ خالد محمود خضر سرانجام دے رہے ہیں۔ (ادارہ)

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘ آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاءاللہ)

تواصی بالصّبر

ڈاکٹراسراراحمدؒ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ___ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾ (العصر)

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۳۳ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝۳۴ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝۳۵﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۵﴾ (البقرۃ)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ○ وَ احْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ○ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ، اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنَا رُشْدَنَا وَ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا، رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ ___ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

صبر کی اہمیت اور مفہوم

آج کی گفتگو سورۃ العصر میں بیان کردہ کامیابی و نجات کی چار شرائط میں سے آخری شرط ''تواصی بالصبر'' سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے صبر کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مراد ہے! اس کے مراتب و مراحل کیا ہیں؟ دین میں کس کس اعتبار سے صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کتنا صبر درکار ہے؟

ہمارے دین میں ہر مقام پر چوٹی کی چیز صبر ہے۔ سورۃ العصر میں بھی آخری بات صبر ہے:

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾﴾

سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات میں حضور ﷺ کو خصوصی خطاب ہوا' اس میں بھی آخری بات صبر بیان ہوئی:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۪ۙ﴿۶﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ؕ﴿۷﴾﴾

سورۃ المزمل میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صبر کی خصوصی تلقین فرمائی:

﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۱۰﴾﴾

سورہ حٰمٓ السَّجدۃ میں مقامِ دعوت کا ذکر ہے اور اس اعتبار سے بھی جس اہم ترین چیز کا ذکر آیا' وہ صبر ہے:

﴿وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ﴿۳۵﴾﴾

سورۃ البقرہ کی مشہور آیات جن کی تلاوت آغاز میں کی گئی' ان میں بھی فرمایا گیا: ﴿وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ ساتھ ہی ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾﴾۔ پھر فرمایا گیا: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ —— ان آیاتِ مبارکہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے دین میں صبر کا کیا مقام ہے!

صبر کا مفہوم ہے اپنے آپ کو روکنا' تھامنا' برداشت کرنا' تحمل کرنا۔ اپنے طے شدہ

مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی مخالفت سے بددل ہوئے بغیر پیش قدمی کرتے رہنا۔گویا کوئی تکلیف و مخالفت ہراساں نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی لالچ منحرف کر سکے۔ ان دونوں چیزوں سے کوئی تاثر لیے بغیر جو راستہ طے کیا ہے' اُدھر ہی چلتے رہنا۔ دراصل دنیا میں کسی شخص کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لیے دو حربے استعمال کیے جاتے ہیں : تشدد' تکلیف' ایذا یا پھر لالچ' کسی قسم کی رشوت۔ان دونوں چیزوں کا کوئی اثر قبول کیے بغیر انسان کا اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے پوری ثابت قدمی' استقلال اور پامردی کے ساتھ پیش قدمی کیے چلے جانا صبر ہے۔

صبر سے پہلے تَوَاصَوْا اور تَوَاصِی کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تَوَاصَوْا فعل ماضی ہے جبکہ تَوَاصِی مصدر ہے۔جیسے ''آنا'' مصدر ہے، ''آیا'' فعل ہے ، ''آئے گا'' فعل مستقبل ، ''آتا ہے'' فعل حال ہے۔ چنانچہ تَوَاصَوْا باب تفاعل میں فعل ماضی (جمع مذکر) ہے اور تَوَاصِی اس کا مصدر ہے۔ باب تفاعل کی خاصیات کی وجہ سے دو معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک مبالغہ یعنی زور شور کے ساتھ' شدّ و مد کے ساتھ' بڑے اہتمام سے' پوری قوت کے ساتھ صبر کی تلقین کرنا تواصی بالصبر ہے۔ دوسرا مفہوم اشتراک کا ہے یعنی آپس میں ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ آپ مجھے صبر کی تلقین کریں' میں آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے جماعت ضروری ہے جس میں ایک دوسرے کو وصیت کی جا رہی ہو' کیونکہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ کبھی کسی کا جذبہ بہت قوی ہوتا ہے لیکن کبھی پژمردگی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی جماعت میں شامل ہیں تو کوئی ساتھی آپ کی ہمت بندھا دے گا لیکن اگر ایک فرد ڈھیلا پڑ جائے تو شیطان کے حملہ کی وجہ سے وہ پیچھے ہی جاتا رہتا ہے۔

جماعتی زندگی کی مثال ایسی ہے کہ اگر سیلاب کا کوئی تیز دھارا آ رہا ہو تو آدمی اکیلے نہیں کھڑا رہ سکتا' پانی اسے بہا لے جائے گا۔ البتہ اگر پندرہ بیس آدمی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جائیں تو کھڑے رہنے کی اُمید ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔'' اور

((يَدُ اللهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ))[سنن الترمذی] ''اللہ کا ہاتھ (یعنی اُس کی مدد و نصرت اور تائید) جماعت کے ساتھ ہے۔'' ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ)) [سنن الترمذی] ''تم پر لازم ہے کہ جماعت کی شکل اختیار کرو۔'' اسی طرح فرمایا: ((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اللهُ اَمَرَنِي بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ، وَ السَّمْعِ، وَ الطَّاعَةِ، وَ الْهِجْرَةِ، وَ الْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللهِ))[مسند احمد] ''میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں' مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے: جماعت کا' (امیر کی بات) سننے اور ماننے کا' اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔'' اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جِدّ و جُہد کی جو ذِمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے' اس کے لیے اِن پانچ باتوں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس حوالہ سے آج یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم انگریز یا فرانسیسیوں کے غلام ہیں' ہمارا اختیار نہیں۔ اب تو وہ دور ختم ہو گیا' اکثر و بیشتر اسلامی ممالک آزاد ہیں' اس لیے اب ہم اللہ کے ہاں اس حوالہ سے بہت زیادہ جواب دہ ہیں۔

سورۃ العصر میں تَوَاصَوْا کے لفظ سے دو مفہوم سامنے آتے ہیں۔ انتہائی تاکید اور مبالغہ کے ساتھ کسی کام کو کرنا یعنی پوری امکانی استطاعت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک دوسرے کو صبر کی تاکید و تلقین کرنا' ایک دوسرے کی ہمت بندھانا اور ایک دوسرے کے لیے سہارا بننا جو کہ جماعتی زندگی کا خاصّہ ہے۔ گویا سورۃ العصر کے مطابق مسلمانوں کو اس راستہ پر چلنے کے لیے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہے۔ صبر کے مختلف مراحل کو سمجھنے کے لیے سہ منزلہ عمارت کا نقشہ ذہن نشین ہونا چاہیے۔ دراصل یہ ایک فریم آف ریفرنس ہے جس کے حوالہ سے جہاد کی طرح صبر کے مراحل بھی سمجھ میں آسکیں گے۔

دینی فرائض کی منازل اور ان کے تقاضے

دینی فرائض کی پہلی منزل خود اللہ کا بندہ بننا ہے یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت۔ پوری زندگی میں ہمہ تن' ہمہ جہت اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ہر حکم کی کُلّی اطاعت کی جائے' جزوی نہیں۔ پوری طرح سرنڈر کرنا' سرِ تسلیم خم کرنا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾

(البقرۃ:۲۰۸) ’’اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ‘‘ جو شخص دوسری منزل کی طرف جانا چاہتا ہے تو اُسے اوّلاً پہلی منزل کا اہتمام کرنا ہوگا۔ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنے سے پہلے اپنا دامن جھانکنا ضروری ہے۔ اس منزل کے تین جہاد ہیں:

(۱) اپنے نفس سے (۲) شیطان سے (۳) بگڑے ہوئے معاشرے سے

اس منزل پر دو طرح کے صبر ہوں گے:

(۱) صبر علی الطاعة (۲) صبر عن المعصية

صبر علی الطاعة یعنی اطاعت پر صبر کرنا‘ جم جانا۔ ناگوار کیفیات کو برداشت کرتے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتا رہے‘ جیسے موسم سرما میں فجر کی نماز کے لیے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بغیر صبر کے ممکن نہیں۔ اسی کیفیت کا منفی رُخ صبر عن المعصية ہے‘ یعنی اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی کے ہر کام سے روکنا اور صبر کرنا۔ ناجائز کام کرنے کے بدلہ رشوت پیش کی جائے تو ظاہر ہے نفس اس طرف ترغیب دے گا لیکن اُس وقت اپنے آپ کو روکنا اور صبر کرنا ہوگا۔ فجر کی اذان کی آواز آجائے تو نفس کے تقاضوں کو پیچھے ڈال کر نماز کی ادائیگی کرنا ہوگی۔ ہر وہ چیز جو نفس کو مرغوب لیکن اللہ کے حکم کے خلاف ہو‘ اس سے نفس کو روکنا اور تھامنا صبر عن المعصية ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب اِمرأۃُ العزیز نے گناہ کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے آپ کو اس سے روکا۔ خود رسول اللہ ﷺ خطبات میں اپنے آپ کو بھی مخاطب فرماتے: ((اُوْصِیْکُمْ وَ نَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰہِ)) ’’لوگو! میں تمہیں اور اپنے نفس کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔‘‘ بہر حال پہلی منزل کے یہ دو صبر ہیں۔ صبر علی الطاعة مثبت طور پر ہے اور صبر عن المعصية منفی صبر ہے۔

دوسری منزل دعوت و تبلیغ کی ہے۔ سورۃ النحل میں دعوت کی تین سطحیں بتائی گئی ہیں:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (آیت ۱۲۵)

’’(اے نبی ﷺ!) دعوت دیجیے اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مناظرہ کیجیے جو بہت اچھے طریقہ سے ہو۔‘‘

معاشرہ کی ذہین اقلیت کو دلائل و براہین کے ساتھ اللہ کے راستہ کی طرف بلانا ہو‘ عوام الناس کو دل پر اثر کرنے والی کوئی بات پہنچانی ہو یا غیر مسلم مبلغین سے مناظرہ ومجادلہ کا مرحلہ ہو‘ ان تینوں سطحوں پر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو مذکورہ میدانوں میں سپیشلائز کرنے کے لیے سامنے آئیں اور اس کام کے لیے اپنے آپ کو کُل وقتی طور پر وقف کر دیں۔ اس منزل پر صبر خصوصاً اپنے career کا ہوگا۔ ایک شخص میں اگر ذہانت ہے تو وہ کسی نفع بخش پیشے سے منسلک ہوگا‘ مثلاً ڈاکٹر یا انجینئر ہوگا۔ اُسے بڑی معقول تنخواہ مل رہی ہوگی۔ اب اگر ایسا شخص اپنی زندگی کا رُخ موڑ کر اپنی صلاحیت دین کی دعوت وتبلیغ کی طرف لگائے تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کے کریئر کا نقصان ہوگا۔ اس کی آمدنی میں کمی آئے گی۔ اسے اپنے ذاتی مفادات اور شاندار مستقبل کے حوالہ سے قربانی دینی پڑے گی۔ اس کے لیے بہت صبر درکار ہے۔

اس حوالہ سے قادیانی نوجوانوں کی مثال ہے جو تبلیغ کے لیے تربیت حاصل کرتے ہیں اور اپنی زندگی اس کام میں وقف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں عیسائیت تیزی سے پھیل رہی ہے کیونکہ اس کے پادری جو سرد ترین ممالک کے رہنے والے ہیں‘ وہ گرم ترین ممالک میں آ کر کام کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بہت سوچنے کا مقام ہے کہ آج ہم میں سے کتنے لوگ اپنے بچوں کو دین کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہیں! ہمارے ہاں جو صاحبِ حیثیت لوگ ہیں وہ تو اس طرف آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ان سے اس بارے میں بات کی جائے تو کہہ دیتے ہیں: بھائی چندہ لے لو‘ بس کافی ہے‘ ہم اپنی اولاد کو اس کام کے لیے نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارا حال ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں دینِ حق پامال ہے۔ صبر کے بغیر اس کام کے لیے لوگ تیار نہیں ہو سکتے۔ ہر ذہین آدمی اپنے وقت اور صلاحیت کو دنیا میں لگا کر پیسہ کما سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنی ذہانت معاشرہ میں اعلیٰ علمی سطح پر دین کی دعوت دینے کے لیے لگائے تو یہ چیز دنیا میں کسی کمائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ گویا دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے معاش کی قربانی تو دینی پڑے گی۔ اپنی ذہانت کو اس طرف لگانے سے دنیاوی کمائی میں جو کمی

آ رہی ہے‘ اس کو جھیلنا اور خوش دلی سے برداشت کرنا صبر ہے۔

دعوتِ حق میں تمسخر و استہزاء: صبر کا امتحان

اس منزل پر صبر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب بھی دعوتِ حق پیش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے استہزاء اور تمسخر کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالہ سے اُسوۂ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہمارے سامنے ہے۔ مکہ والے آپ ﷺ کو صادق و امین کہتے تھے۔ آپؐ ان کی محبوب شخصیت تھے لیکن جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو اُن ہی لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں (معاذ اللہ!) مجنون‘ ساحر‘ شاعر‘ پاگل‘ کذّاب‘ کاہن‘ جادوگر جیسے الفاظ استعمال کیے۔ تصور کیجیے کہ آپ ﷺ کسی مجمع میں تشریف لے جارہے ہیں اور اطراف سے اس قسم کے فقرے آتے ہیں تو یقیناً آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کو تکلیف پہنچتی تھی۔ سورۃ الحجر میں یہ بات آئی:

﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ۝۹۷﴾

”(اے نبی ﷺ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں‘ اس سے آپ کے سینہ میں گھٹن ہوتی ہے۔“

یعنی ان کڑوی کسیلی باتوں‘ استہزاء و تمسخر سے آپؐ کو جو گھٹن اور صدمہ کی کیفیت ہوتی ہے‘ وہ اللہ جانتا ہے۔ وہ لوگ کبھی قرآن کا مذاق اُڑا رہے ہیں کہ فلاں آیت میری ہے‘ فلاں تم لے جانا۔ کبھی اس آیت کا مذاق اُڑایا جارہا ہے کہ جہنم پر انیس فرشتے مقرر ہیں تو کسی نے کہا کہ دس کو تو میں اکیلے سنبھال لوں گا‘ باقی نو سے تم سب نمٹ لینا۔ بہرحال حضور ﷺ کے کانوں میں یہ باتیں جارہی تھیں‘ جس کی وجہ سے دل شدید صدمہ میں تھا۔ اسی لیے سورۃ القلم میں آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی جارہی ہے:

﴿نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا يَسۡطُرُوۡنَ ۝۱ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۝۲ وَاِنَّ لَكَ لَاَجۡرًا غَيۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۝۳ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ۝۴﴾

”قسم ہے قلم کی اور جو لکھتے ہیں۔ آپؐ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) مجنون نہیں۔ اور بے شک آپؐ کے لیے یقیناً نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بہت اونچے اخلاق پر ہیں۔‘‘

گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان لوگوں کی باتوں سے جو کچھ جھیلنا پڑ رہا تھا‘ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دل جوئی ان الفاظ میں کی۔

سیرتِ مبارکہ اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ جب قریش کو معلوم ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اُوپر وحی کے نازل ہونے کا اعلان کیا ہے تو ایک سردار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آ کر کہا: ’’بھتیجے! اگر تم پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے یا کوئی آسیب آ گیا ہے تو مجھے بتا دو۔ میرے بہت سارے عاملوں سے تعلقات ہیں‘ میں کسی کو بلا کر تمہارا علاج کروا دیتا ہوں۔‘‘ سوچیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل پر کیا بیتی ہو گی!

پہلے چار برس تک تو اس نوع ہی کی مخالفت ہوتی رہی اور اس کے بعد جسمانی تشدد کا بھی آغاز ہوا۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تبلیغ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مذہبی تبلیغ جیسے عیسائیت کی تبلیغ اور دوسری انقلابی تبلیغ جیسے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تبلیغ کا انداز۔ اس طرح کی تبلیغ پر معاشرہ کی طرف سے پہلا ردِّعمل یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا دماغ خراب ہوا ہے اور چند سر پھرے نوجوان اس کے ساتھ ہو گئے ہیں مگر ان سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بس ان کا استہزاء و تمسخر‘ اور مذاق اُڑاتے رہو۔ ان کی شخصیتوں کو داغ دار کر دو‘ ان کی ہمتوں کو توڑ دو‘ ان کے حوصلے پست (demoralize) کر دو۔ مکی معاشرہ میں یہی ہوا‘ اور آج بھی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت لے کر اُٹھا جائے گا تو وہی ردِّعمل ہمارے سامنے بھی آئے گا جو اُس وقت آیا تھا۔ چنانچہ یہ درحقیقت صبر کا امتحان ہے۔ انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے‘ قوتِ ارادی اور عزیمت مضمحل ہوتی جاتی ہے‘ تو کیا وہ دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائے یا استقامت کے ساتھ کام کرتا رہے!

بہرحال یہ صبر کا ایک اہم رُخ ہے کہ استہزاء‘ تمسخر‘ مذاق اُڑنے‘ دقیانوسی کہے جانے‘ ان سب چیزوں پر صبر کیا جائے۔ اگر اللہ ہمیں مقامِ دعوت پر فائز ہونے کی توفیق عطا فرمائے تو ان تمام مراحل کے حوالہ سے قرآن و سیرتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہدایات نظر آ جاتی ہیں۔

اس مرحلہ پر دو قسم کے صبر ہمارے سامنے آئے۔ دنیاوی کریئر کی قربانی اور دعوت

کے ردِعمل پر آنے والی مشکلات پر صبر۔ پھر صبر کی اعلیٰ ترین شکل کا بیان سورۂ حٰم السجدہ میں بایں الفاظ ہوا:

﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵﴾

’’اور یہ مقام (سعادت) نہیں حاصل ہو سکتا مگر ان ہی لوگوں کو جو بہت صبر کرتے ہوں‘ اور یہ (مقام) نہیں دیا جاتا مگر ان ہی کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔‘‘

عدمِ تشدد اور صبرِ محض کا مرحلہ

مقامِ دعوت پر فائز شخص کے لیے یہ صبر لازم ہے کہ لوگ گالیاں دیں اور وہ دعائیں دے‘ لوگ پتھراؤ کریں اور وہ پھول پیش کرے‘ لوگ ماریں تو بھی ان پر ہاتھ نہ اُٹھایا جائے‘ تاکہ دعوت کا کام آگے بڑھ سکے۔ گو شریعت میں قانون تو ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ‘ دانت کے بدلے دانت‘ کان کے بدلے کان‘ لیکن مقامِ دعوت کے اعتبار سے قانون کچھ اور ہوگا یعنی جھیلو‘ برداشت کرو‘ ماریں کھاؤ‘ ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ اس کا نام صبرِ محض (Passive Resistance) ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بارہ برس یہی قانون نافذ کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہی کہا گیا کہ چاہے کتنا ہی مارا جائے‘ جواباً کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ مزاحمت تو کی جائے گی مگر اس طرح کہ ان کا توحید اور حضرت محمد ﷺ کا دامن چھوڑنے کا جو دباؤ ہے‘ اس کے خلاف ڈٹا رہا جائے‘ اس سے پیچھے نہیں ہٹا جائے۔ حضرات بلال‘ ابوفکیہہ اور خباب بن الارت وغیرہم رضی اللہ عنہم پر شدید ترین مظالم کیے جا رہے تھے اور وہ برداشت کر رہے تھے‘ حالانکہ جب کوئی آدمی desperate ہو جائے تو اس میں بڑی قوت آ جاتی ہے کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں دو‘ چار کو مار کر ہی مروں‘ لیکن چونکہ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے کسی نے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ سورۃ النساء میں یہ بات آئی: ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ (آیت ۷۷) ’’اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو۔‘‘ گویا ڈٹے رہو‘ جمے رہو‘ کھڑے رہو‘ جھیلو‘ برداشت کرو‘ صبر کرو‘ پیچھے نہ ہٹو۔ نہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے دامن کو چھوڑنا‘ نہ توحید کے راستہ سے منہ موڑنا‘ لیکن ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں‘ کیونکہ ابھی انقلابی عمل کے مرحلہ سے گزر

رہے ہیں۔ ابھی تو انقلاب لانا ہے‘ اسلامی حکومت قائم کرنی ہے۔ جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بدلہ کا قانون لاگو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں خود نبی اکرم ﷺ کو مختلف پیراؤں میں صبر کا حکم دیا گیا:

﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاھۡجُرۡھُمۡ ھَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝۱۰﴾ (المزمل)

’’اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔‘‘

﴿وَلِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ۝۷﴾ (المدثر)

’’اور اپنے رب کے لیے صبر کریں۔‘‘

﴿فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف: ۳۵)

’’تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے ہیں۔‘‘

﴿فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ﴾ (القلم: ۴۸)

’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ انتظار کیجیے اپنے ربّ کے حکم کا۔‘‘

﴿وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ (النحل: ۱۲۷)

’’اور (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے۔‘‘

مکی معاشرہ میں غلام طبقہ کے ساتھ بہت ہی روح فرسا سلوک کیا گیا‘ کیونکہ اس معاشرہ میں غلاموں کے کوئی حقوق تھے ہی نہیں۔ اگر کوئی اپنے غلام کو ذبح بھی کر دے تو اس سے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا تھا‘ کیونکہ بطور مالک وہ جو چاہے سلوک اپنی ملکیت کے ساتھ کرسکتا تھا۔ اس سے کوئی باز پرس کا معاملہ نہیں تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اُن کا آقا اُمیہ بن خلف گردن میں رسّی ڈال کر سخت گرم دوپہر میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر حیوانوں کی طرح گھسیٹتا۔ کبھی توے کی طرح جلنے والی زمین پر چِت لٹا کر‘ ایک بھاری سِل چھاتی پر رکھ دی جاتی کہ منہ سے آواز تک نہیں نکل پا رہی ہوتی لیکن اس حال میں بھی ’’اَحَد‘ اَحَد‘‘ کے الفاظ ان کی زبان پر ہوتے۔ غلام طبقہ شدید ایذا اور ابتلا کا شکار ہوا لیکن توحید اور

محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر قائم رہا۔

چشمِ تصوّر سے اس بدترین رَوِش کو دیکھیے جو ابوجہل نے حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھی۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ یمن کے رہنے والے بہت نیک انسان تھے۔ انہیں خواب میں بشارت ہوئی کہ مکہ میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ظہور ہونے والا ہے' ان تک پہنچ جاؤ۔ اس لیے وہ یمن سے ترکِ وطن کر کے مکہ آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ابوجہل سے معاہدہ کیا اور اس کے حلیف بن کر رہنے لگے' کیونکہ اُس وقت مکہ میں صرف قریشی رہ سکتے تھے یا کسی قریشی کا حلیف یا کسی قریشی کا غلام۔ ابوجہل کے چچا کی کنیز حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت یاسرؓ نے ان سے نکاح کر لیا' جن سے ایک بیٹے حضرت عمار بن یاسرؓ ہوئے۔ جب ابوجہل کے چچا کا انتقال ہو گیا تو یہ خاندان ابوجہل کے رحم و کرم پر ہو گیا اور اس نے ایمان لانے کی وجہ سے ان تینوں افراد کے ساتھ بدترین معاملہ کیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو کچھ کیا گیا' اس کا تصور ممکن نہیں۔ ان کے جسم کے نازک حصوں کو جلایا جاتا۔ ابوجہل کہتا تھا کہ ایک دفعہ اقرار کر لو کہ میرے بُت بھی اِلٰہ ہیں' میں تمہیں چھوڑ دوں گا لیکن یہ میاں بیوی کسی طریقہ سے تیار نہیں ہوئے۔ یہ ہے صبر' یہ ہے استقلال' یہ ہے ثبات! تنگ آ کر اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شرم گاہ میں برچھا مارا اور شہید کر دیا۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ ستا ستا کر' تنگ کر کر کے آخر کار جو انہیں شہید کیا تو اس طرح کہ چار سانڈ اونٹوں کو رَسّے باندھ کر ایک رسّے سے ان کا ایک بازو' دوسرے سے دوسرا بازو باندھا' تیسرے سے ایک ٹانگ' چوتھے سے دوسری ٹانگ باندھی اور چاروں کو دوڑایا کہ جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب آلِ یاسر کے گھر کے سامنے سے گزرتے تو فرماتے: ((صَبْرًا يَا آلَ يَاسِر، فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةَ)) [المستدرک علی الصحیحین: ۵۶۴۶] ''صبر کرو اے آلِ یاسر! کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔'' اِدھر آنکھ بند ہوئی' اُدھر جنت میں تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ یہی تواصی بالصبر ہے اور محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی کے مطابق عمل فرما رہے تھے۔

یہاں پر ایک دوسرے پہلو کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ دین میں عزیمت کے ساتھ

رخصت کا پہلو بھی ہے۔ حضرت یاسر اور حضرت سمیّہ ؓ سید الشہداء بنے۔ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی جان دینے والی خاتون اور سب سے پہلے جان دینے والے شخص۔ توحید کے لیے‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے لیے صداقت کی گواہی دیتے ہوئے بوڑھے والدین نے اپنی جانیں دے دیں‘ لیکن نوجوان حضرت عمار ؓ نے رخصت کی راہ اختیار کی۔ ان سے جھیلا نہیں گیا‘ برداشت نہیں ہو سکا۔ ایک مرتبہ کلمۂ کفر زبان سے نکال دیا تو ابوجہل نے ان کو چھوڑ دیا‘ لیکن اب پشیمانی طاری ہوئی کہ میں کیا کر بیٹھا! اُس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا کہ حضور ﷺ ہی آ کر مجھے یہاں سے کھولیں ورنہ یہیں پر اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ حضور ﷺ خود تشریف لائے‘ دست مبارک سے کھولا اور کہا کہ اس کی بھی دین میں اجازت ہے کہ کلمۂ کفر کہہ کر جان بچالی جائے۔ یہ رخصت کا راستہ ہے‘ عزیمت کا نہیں۔ تمہارے والدین نے جو مقام حاصل کر لیا‘ ان کو تو رتبہ بلند ملا۔ البتہ قرآن کی اس آیت سے یہ رہنمائی ملتی ہے: ﴿اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ﴾ (النحل:۱۰۶) یعنی اگر دل ایمان پر جما ہوا ہو تو کسی وقت محض جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینے کی اجازت ہے۔ کمزور طبائع کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں accommodate کیا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی ہمت بندھائی کہ گھبراؤ نہیں‘ اگر تمہارے دل کے اوپر کوئی اثر نہیں ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔

صبرِ محض کا فلسفہ

اس ساری صورت حال کا فلسفہ بھی سمجھ لینا چاہیے۔ جس وقت ابوجہل اس خاندان کے ساتھ یہ بدترین سلوک کر رہا تھا‘ اُس وقت جو تیس یا چالیس مسلمان موجود تھے وہ نعوذ باللہ‘ نہ بے غیرت تھے اور نہ ہی بے حمیت کہ اپنے بھائی بہن کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سب صادق الایمان تھے لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کی طرف سے ایسا کچھ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ہے ڈسپلن کی وہ تربیت جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی کی تھی۔ دراصل جوش میں آ کر حملہ کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا یہ کہ خون کھول رہا ہو لیکن چونکہ اجازت نہیں ہے لہٰذا کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ یہ زیادہ کڑا

امتحان ہے‘ یہ زیادہ مشکل ہے اور اسی کی تربیت دی محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے۔ مکی دور کے ۱۲ سالوں میں سے ابتدائی ۴ سال صرف زبانی کلامی ایذا تھی‘ اور اس کا ہدف صرف حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ تھی۔ ان کو شاعر‘ ساحر‘ مجنون کہا گیا۔ کسی نے کہا کہ انہوں نے ایک عجمی غلام کو گھر میں رکھا ہوا ہے‘ اس سے dictation لیتے ہیں اور ہم پر رعب جماتے ہیں کہ وحی نازل ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ چار برس تک حضور ﷺ کے ساتھ ہوتا رہا تاکہ آپ ﷺ کو اتنا demoralize کر دیا جائے کہ ہمت ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ نہ حضرت محمد ﷺ بددل ہوئے اور نہ ان کے ساتھی‘ بلکہ یہ دعوت پھیلتی جا رہی ہے۔ ہمارے نوجوان ان کے حلقہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر‘ حضرت عثمان غنی‘ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جیسے قریش کے اعلیٰ گھرانوں کے چشم و چراغ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے غلاموں میں بھی یہ آگ پھیل گئی ہے تو یوں سمجھیے جیسے بارود کے اندر آگ سی لگ گئی۔ ابھی تک تو ہم ان پر ظلم کر رہے تھے لیکن ان کے اندر اگر یہ ایمان اور اسلام کی دعوت و تحریک پھیل گئی تو ہمارا اقتدار‘ ہمارا پورا نظام چوپٹ ہو جائے گا۔ لہٰذا اب اپنی پوری قوتوں کو جمع کرو‘ انہیں مارو اور کچل دو۔ یہ کام ہوا ہے ۴ نبوی سے ۱۲ نبوی تک۔ آٹھ برس تک physical persecution کا معاملہ ہوا۔ نوجوانوں پر تشدد‘ مار پیٹ‘ جلانا‘ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹانا‘‘ زنجیریں ڈال دینا‘ گھروں میں بند کر دینا‘ بھوکے رکھنا جیسے ظلم کیے گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا نے ایک چٹائی کے اندر لپیٹا اور ایسی دھونی دی کہ دم گھٹا جا رہا ہے‘ جان نکل رہی ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایسے نوجوان تھے جن کا دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ جدھر سے نکل گئے‘ ان کی خوشبو کی وجہ سے پوری گلی معطر ہو گئی۔ ان کا باپ تو مر چکا تھا‘ دولت بہت چھوڑ کر گیا تھا‘ لہٰذا ماں نے بڑے ناز و نعم اور لاڈ پیار میں پالا۔ عرب کے معاشرے میں چونکہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی‘ اس لیے سربراہِ خاندان چچا تھا۔ چچا نے کہا: ’’مصعب! اگر تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے تو اس کی دولت پر بھی تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ نکل جاؤ گھر سے!‘‘ اس نے یہ

سوچا کہ توحید کا یہ سارا نشہ ہرن ہو جائے گا‘ لیکن حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کا جواب بالکل برعکس تھا۔ فرمایا: ’’اچھا ٹھیک ہے چچا جان۔ میں گھر چھوڑتا ہوں۔‘‘ وہی بات جو کبھی کہی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہ جب اس نے کہا تھا: جاؤ چلے جاؤ‘ دُور ہو جاؤ میری نگاہوں سے‘ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تھا: ’’ابا جان! آپ کا حکم یہی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ آپ پر سلامتی ہو۔ میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں اس سے آپ کے لیے استغفار کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر چل دیے۔ قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہی معاملہ ہوا۔ وہ بھی توحید کے لیے گھر چھوڑ کر نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ غصہ میں آکر چچا نے اگلی بات کہی: ’’یہ کپڑے جو تم نے پہنے ہوئے ہیں یہ بھی مشرک باپ کی کمائی سے ہیں‘ اتاروان کو!‘‘ انہوں نے کپڑے بھی اُتار دیے۔ مادرزاد برہنہ گھر سے نکالے گئے۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لپیٹ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مدینہ کے بارہ افراد ایمان لائے‘ بیعتِ عقبہ اولیٰ ہوئی تو انہوں نے کہا کوئی اپنا شاگرد دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا: ’’مصعبؓ! اب مدینہ جاؤ‘ یثرب والوں کو قرآن پڑھاؤ‘ انہیں تبلیغ کرو۔‘‘ حضرت مصعبؓ وہاں گئے اور ایک سال کی محنت کی کمائی ۷۵ افراد اگلے سال لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیے۔ ۷۲ مرد اور ۳ عورتوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کی۔ ان ۷۵ افراد کی درخواست ہی پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے اور اُس وقت ان کے جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ جب ایک ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا دوسرے ہاتھ سے تھام لیا اور دوسرا بھی کٹ گیا تو دونوں ہاتھوں کے بچے ہوئے حصوں سے جھنڈے کو تھام لیا‘ گرنے نہیں دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کی شکل وصورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت مشابہ تھی‘ اس لیے خبر اُڑ گئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے۔ جب ان کو دفن کرنے کا وقت آیا تو شہید کے لیے کفن وہی لباس ہوتا ہے جو اُس نے

شہادت کے وقت زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے سامنے مسئلہ پیش کیا گیا کہ ان کے جسم پر تو ایک چادر ہے اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس سے اگر سر ڈھانپتے ہیں تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیر ڈھانپتے ہیں تو سر کھل جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’سر چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس پھونس ڈال دو۔‘‘ یہ آخری لباس ہے جو حضرت محمد ﷺ کے اس دیوانے کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت ملا ہے جس کا دو دو سو درہم کا جوڑا سلتا تھا۔ صبر و برداشت کی اعلیٰ مثال! اصل میں یہی چیزیں ہیں جو ہمارے دل کو منور کرتی ہیں۔ وہ نورِ ایمان کے علم بردار تھے۔

جان لیجیے کہ دینی فرائض کی تیسری منزل یعنی اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد میں صبر کا پہلا درجہ ہوگا صبرِ محض۔ مکی دور کا فلسفہ یہی Passive Resistance ہے‘ خصوصاً آٹھ سال تک۔ دراصل انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت فیصلہ کن چیز ہے‘ کیونکہ آغاز میں انقلابی لوگ تعداد میں کم ہوتے ہیں جبکہ جو نظام قائم ہے اس کے پاس بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے پُرتشدد (violent) ہو جائیں گے تو اس نظام کو اخلاقی جواز حاصل ہو جائے گا ان لوگوں کو کچل دینے‘ ختم کر دینے کا۔ جب وہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تو نظام کے پاس ظلم و تشدد کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہتا۔ اگر پھر بھی مار رہے ہیں تو ایسے میں عوام الناس کی دلی ہمدردیاں انقلابیوں کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اُمیہ بن خلف نے بلال ؓ کو آج اتنا مارا تو کیوں مارا؟ کیا اُس نے کوئی چوری کر لی تھی؟ نہیں۔ کیا کوئی اور گستاخی کی تھی اپنے آقا کی؟ نہیں۔ بس صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ایک اللہ کو مانتا ہے اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آیا ہے۔ اس صورتِ حال کا کیا اثر ہوگا؟ سوچیے! ایک زندہ انسان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے۔ ان انگاروں سے کمر کی کھال جلی‘ چربی پگھلی اور اس پگھلنے والی چربی سے وہ انگارے ٹھنڈے پڑے۔ یہ سب کچھ وہ جھیل رہا ہے۔ دیکھنے والوں نے ضرور سوچا ہوگا کیا جرم تھا اس کا! یہ سب کچھ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ آپؓ پیشے کے لحاظ سے لوہار تھے۔ شریف آدمی‘ بہت اچھے کاریگر تھے۔ وقت پر کام کر دیتے‘ مناسب اجرت لیتے۔ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ

ایک اللہ کو مانتے اور حضرت محمدﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔

ہر معاشرہ میں ایک خاموش اکثریت (silent majority) ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں اکثریت ہمیشہ خاموش ہی ہوتی ہے۔ البتہ وہ اندھی بہری نہیں ہوتی۔ دیکھ رہی ہوتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ سن رہی ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کچھ شریف لوگوں پر تشدد ہو رہا ہے' ان کی کوئی خطا نہیں سوائے اس کے کہ ایک اللہ کو مانتے ہیں تو اندر ہی اندر وہ خاموش اکثریت بدلنے لگتی ہے۔ اس میں اگرچہ اتنی جرأت تو نہیں ہوتی کہ حق بات کا برملا اعلان کریں لیکن ان کے دل بدل رہے ہوتے ہیں۔ آٹھ برس میں حضرت محمدﷺ نے قریش کے دل فتح کیے۔ چاہے وہ ایمان نہیں لائے لیکن اندر سے انہیں نظر آ رہا تھا کون کیا ہے! یہ صبر محض ہے۔

سیرتِ طیبہ میں انقلابی جدّ و جُہد کے مراحل

انقلابی جدّ و جُہد میں سب سے پہلے تو انقلابی نظریہ کی اشاعت ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کو قبول کر لیں' انہیں organize کیا جاتا ہے' ایک جماعت کی شکل دی جاتی ہے۔ پھر ان کی تربیت ہوتی ہے۔ جیسا انقلاب لانا ہے ویسی ہی تربیت کرنی ہو گی۔ پھر باطل نظام سے ٹکراؤ کا مرحلہ آئے گا۔ جب تک اتنی تعداد نہ ہو کہ آپ فیصلہ کن اقدام کر سکیں' اس وقت تک دعوت ہی دینی ہے۔ لوگوں کی نفری اپنے اندر شامل کرنی ہے۔ اپنی قوت بڑھانی ہے۔ اپنی تربیت و اصلاح کرنی ہے اور صبر کرنا ہے۔ retaliate نہیں کرنا' اقدام نہیں کرنا' جوابی کارروائی نہیں کرنی۔ یہ وہ کام ہے جو بارہ برس ہوا۔ پھر جب ایسے جاں نثاروں کی ایک devoted اور dedicated تعداد تیار ہو گئی جو منظم و تربیت یافتہ تھی' سختیوں کی بھٹیوں سے نکلے ہوئے لوگ' منظم ایسے کہ حضورﷺ کے ہر حکم پر عمل پیرا' سمع و طاعت کے خوگر' تو اب باطل نظام کے خلاف اقدام کر سکتے ہیں۔ تبھی جا کر مدنی دور میں اقدام کا مرحلہ آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ عطا فرما دی یعنی مدینہ منورہ' تو یہ base ملنے کے بعد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طاقت میسر آنے کے بعد ہی انقلابی عمل میں اقدام کا مرحلہ آیا۔ دورانِ سفرِ ہجرت جب حضورﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے

تھے‘ سورۃ الحج کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ ﴿۳۹﴾﴾

’’اجازت دی جارہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے‘ اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور یقیناً اللہ اُن کی نصرت پر قادر ہے۔‘‘

جن پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے ان کے لیے ابھی تک حکم تھا کہ ہاتھ باندھے رکھو‘ آج سے ان کے ہاتھ کھول دیے گئے کہ تم بدلہ لے سکتے ہو‘ جوابی کارروائی کر سکتے ہو۔ یہ آیت ٹرننگ پوائنٹ ہے اگلے مرحلہ کے لیے۔ اس موقع پر حضورﷺ نے جو کچھ کیا‘ سیرت کی کتابوں میں وہ واقعات موجود ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت کیا ہے؟ ان سے نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس جانب زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

حضورﷺ نے مدینہ پہنچ کر چھ مہینے تو کوئی اقدام نہیں کیا بلکہ صرف اپنی پوزیشن کو consolidate کیا۔ تین اہم کام کیے‘ مسجد نبویؐ کی تعمیر‘ جو کہ بطور ایک مرکز وجود میں آئی۔ وہی آپ کی تربیت گاہ ہے‘ خانقاہ ہے‘ وہی گورنمنٹ ہاؤس ہے‘ وہی درس گاہ ہے‘ اصحابِ صُفّہ کا ٹھکانا ہے۔ نماز باجماعت‘ خطبہ جمعہ‘ سب کچھ مسجد نبویؐ میں ہو رہا ہے۔ دوسرا کام یہ کیا گیا کہ یہودی قبائل کو معاہدوں میں جکڑ لیا تا کہ مدینہ کا جوائنٹ ڈیفنس کیا جاسکے۔ یہ طے ہو گیا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوگا تو مل جل کر دفاع کریں گے۔ یہ ایک بہت دُور بینی اور پیش بندی کا اقدام محمدٌ رسول اللہﷺ نے کیا۔ تیسرا کام تھا مؤاخات۔ مہاجرین اور انصار کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک انصاری‘ ایک مہاجر بھائی بھائی ہو گئے۔ انصار نے گھر تقسیم کر دیے‘ دکانیں تقسیم کر دیں‘ کاروبار بانٹ لیے۔ یہاں تک واقعہ ملتا ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ اپنے مہاجر بھائی کو گھر لے گئے اور فرمایا: ’’یہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو‘ اسے مَیں ابھی طلاق دے دوں گا تا کہ تم اس سے شادی کر لو۔‘‘ واضح رہے کہ یہ واقعہ ایک ہجری میں ہو رہا ہے جبکہ پردے کا حکم بعد میں آیا ہے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب ۵ اور ۶ ہجری میں نازل ہوئیں۔ اس سے پہلے پردے کا حکم نہیں تھا۔

ان تین اقدامات کے بعد آپ ﷺ نے اب چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے‘ یعنی مکہ والوں کے خلاف اقدام۔ جدید اصطلاح میں دو کام کیے:

(۱) معاشی ناکابندی (Economic blockade of Makkah)

(۲) سیاسی ناکابندی (Political isolation of Quraish)

حضور ﷺ مدینہ کے اطراف میں قبائل کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے آپؐ نے معاہدے کر لیے۔ چنانچہ وہ قبیلہ جو پہلے قریش کا حلیف تھا‘ اب حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہو گیا۔ قریش کی isolation ہو رہی ہے جبکہ حضور ﷺ کی قوت بڑھ رہی ہے۔ قریش کے تجارتی قافلے شام اور یمن جاتے تھے۔ شام کی طرف کا راستہ بدر کے پاس سے گزرتا تھا اور یمن کا راستہ طائف سے ہو کر جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے دونوں راستوں پر دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ ایک لشکر خاص طور پر نخلہ بھیجا بلکہ لشکر بھی کیا‘ ایک چھوٹا سا چھاپہ مار دستہ جو بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اس کے کمانڈر تھے۔ انہیں حضور ﷺ نے ایک خط مہر لگا کر دیا کہ مدینہ سے دو دن کی مسافت پر باہر نکل کر اسے کھولنا اور اس پر جو ہدایات لکھی ہیں ان پر پوری طرح عمل کرنا۔ اتنی رازداری رکھی گئی تھی۔ جب وہ مدینہ سے دو دن کے فاصلے پر باہر چلے گئے تو خط کھولا۔ لکھا تھا کہ وادیٔ نخلہ میں قیام کرو‘ وہاں قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ہمیں اطلاع دیتے رہو۔

یہ لوگ تین سو میل کا سفر کر کے وہاں پہنچے تھے۔ اتفاق سے قریش کا ایک قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا جس سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ مقابلہ ہوا تو قریش کا ایک آدمی جو مشرک تھا‘ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ دو کو انہوں نے گرفتار کر لیا‘ باقی بھاگ گئے۔ جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اسے لے کر حضور ﷺ کے پاس آ گئے۔ آپ ﷺ ناراض ہوئے کہ میں نے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ وہاں قیام کر کے ہمیں اطلاعات دیتے رہو۔ البتہ یہ بات ریکارڈ پر آ جانی چاہیے کہ ہجرت کے بعد جو پہلا قتل ہوا‘ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک کا ہوا۔ اس بات نے مکہ میں آگ لگا دی کہ

اتنی جرأت ہو گئی محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کی! اُدھر ابوسفیان کا ایک تجارتی قافلہ مکہ واپس آ رہا تھا۔ اس نے مکہ والوں کی طرف ایک پیغام پہنچایا کہ میرے قافلے کو (حضرت) محمد (ﷺ) کے آدمیوں سے خطرہ ہے' لہٰذا فوراً مدد کا کوئی انتظام کرو۔ یہ ہے وہ چیز جس کی آڑ لے کر ابوجہل جیسے لوگوں نے مکہ میں ایک لشکر تیار کر لیا اور بدر کی طرف مارچ کیا۔

مسلّح تصادم میں صبر کی خاص اہمیت

یہاں سے پہلی جنگ کا آغاز ہوا۔ حضور ﷺ کی طرف سے اقدام کا آغاز ہوا جو مسلح تصادم (Armed Conflict) تک پہنچا۔ یہ ۲ ہجری کی بات ہے' اور پھر یہ جاری رہا ۸ ہجری تک۔ اندرون ملکِ عرب تصادم کے یہ چھ سال ہیں۔ اس عرصے میں غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد' غزوۂ احزاب' یہ سارے غزوات ہوگئے۔ پھر فتح مکہ' غزوۂ حنین اور تبوک کی جانب پیش قدمی ہوئی۔ ۸ ہجری تک یہ معاملہ مکمل ہو گیا۔

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾

(بنی اسرائیل)

مدنی دور میں آ کر سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳﴾

''اے اہلِ ایمان! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اب تمہاری جِدّوجُہد کا یہ نیا phase شروع ہو چکا ہے۔ مکی دور میں جِدّوجُہد کا کچھ اور تقاضا تھا جبکہ مدنی دور میں کچھ اور درکار ہے۔ اب نظامِ باطل کو چیلنج کرنا ہے۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴﴾ (البقرۃ)

''اور ہرگز نہ کہو انہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مردہ ہیں' بلکہ وہ زندہ ہیں

لیکن تمہیں (ان کی حیات کا) شعور نہیں۔‘‘

آگے صبر کے موضوع پر اہم ترین مقام ہے:

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵)

’’اور دیکھو ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف کی کیفیت سے اور بھوک (فقراور فاقہ) سے‘ اور مالوں‘ جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔‘‘

اس کا مفہوم ایک اور بھی ہے۔ ایک تو یہ کہ جیسے کھجور کی فصل تیار ہے اور غزوۂ تبوک کے لیے جانے کا حکم مل گیا تو اندیشہ ہوا کہ کون اُتارے گا؟ اگر کھجور وقت پر نہیں اُتری تو برباد ہو جائے گی۔ یہ ہوتا ہے پھلوں کا نقصان۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ بسا اوقات بہت سی محنتوں کا نتیجہ انسان دیکھتا ہے کہ ضائع چلا گیا۔ دس سال محنت کی‘ کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ ثمرات محنتیں بھی ہیں۔ محنتوں کے ثمرات کا ضیاع! آپ اگر انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں اور ایک کوشش ناکام ہو جائے تو کوئی پروا نہیں۔ پھر اگلی کی تیاری کریں۔ انگریزی محاورہ ہے:

Hope for the best, but be prepared for the worst.

ایسا نہ ہو کہ دوسری مرتبہ ناکام ہو کر بددل ہو جاؤ۔ چاہے تمہاری ہمتیں جواب دے جائیں لیکن پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ پھر کوشش کی جائے۔ جب تک کامیابی حاصل نہیں ہو جاتی‘ ہمیں یہ کام کیسے چلے جانا ہے۔ بقول فیض:

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم   اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی   اب کے بھی اکارت جائے گی

یہ سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کے واقعات ہیں کہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو اُحد میں شکست پہنچی۔ ۷۰ صحابہؓ شہید ہو گئے۔ اگر اُس وقت مسلمان ہمت ہار بیٹھتے تو گاڑی کیسے آگے چلتی!

﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾﴾

’’اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دے دیجیے صبر کرنے والوں کو۔‘‘

﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾﴾

’’وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی تکلیف آئے (کوئی مصیبت‘ کوئی آزمائش آئے) وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

وہ ہمارا مولا ہے‘ ہمارا آقا ہے۔ اگر اسے یہی منظور ہے تو ہمیں بھی یہی منظور ہے۔ ع ’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!‘‘ مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ جیل گئے تو انہیں اپنی جوان بیٹی کی بیماری کی خبر آئی۔ انہوں نے اس وقت ایک نظم لکھی جس کے دو شعر یہ ہیں: ؎

مَیں ہوں مجبور‘ پر اللہ تو مجبور نہیں　　تجھ سے مَیں دُور سہی‘ وہ تو مگر دُور نہیں!

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو　　نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

یعنی تیری صحت ہمیں چاہیے تو ضرور لیکن اگر ہمارے رب کو منظور نہیں تو ہمیں بھی منظور نہیں۔ یہ ہے راضی برضائے رب کی مطلوب کیفیت! جب تک بندہ مؤمن کی یہ کیفیت نہ ہو‘ وہ میدانِ عمل میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ ’’اور یہی ہیں وہ لوگ جو ہدایت پانے والے ہیں۔‘‘

صبر اور مصابرت: لازم وملزوم

سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت میں صبر کے حوالہ سے دو اہم الفاظ آئے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾﴾

’’اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

یہاں صبر اور مصابرت کے دو الفاظ آئے ہیں اور ان کا باہم وہی تعلق ہے جو جُہد اور جہاد کا ہے۔ صبر یک طرفہ عمل ہے۔ آپ جھیل رہے ہیں‘ برداشت کر رہے ہیں۔ صبر علی المعصیة‘ صبر علی الطاعة‘ صبر علی الابتلاء ‘ یہ سب صبر ہیں۔ مصابرت ہے

صبر کا صبر سے مقابلہ۔ اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا: تمہیں زک پہنچی ہے تو انہیں بھی تو پہنچی تھی۔ بدر میں ان کے بھی ۷۰ مارے گئے تھے مگر ان کے حوصلے تو پست نہیں ہوئے۔ وہ اگلے سال پھر تم پر چڑھائی کر کے آ گئے۔ تم کیوں اتنا بُرا مان رہے ہو۔ تمہارے دل اتنے زخمی کیوں ہو گئے۔ تم اگر توحید کے لیے لڑ رہے ہو تو دیکھتے نہیں کہ ابوجہل نے شرک کے لیے گردن کٹوا دی۔ آج بھی لوگ باطل نظریات کے لیے کتنی قربانیاں دے رہے ہیں۔ باطل چیزوں کے فروغ کے لیے کتنی محنتیں کر رہے ہیں۔ ہمارے کتنے نوجوان ہیں جو اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیں' خاص کر کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگوں میں سے؟ باصلاحیت لوگ' کھاتے پیتے لوگ' ذہنی استعداد رکھنے والے لوگ' وقف کریں اپنے آپ کو دین کے لیے۔ اس کے بغیر کیسے بہار آ جائے گی؟ کیسے رونق آ جائے گی؟ دنیا میں باطل نظریات والے لوگ بھی قربانیاں دیتے ہیں' جانیں دیتے ہیں۔ تو فرمایا اگر تم ان سے زیادہ قربانی نہیں دو گے تو اللہ کی زمین پر اللہ کا دین کیسے غالب ہوگا!

اگر حق کو غالب کرنا صرف اللہ کے ذمہ ہو تو وہ آنِ واحد میں غالب کر سکتا ہے۔ لوگوں کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقابلہ میں کسی باطل کی طاقت کا ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اللہ کو تو ہمارے ایمان کا امتحان اور خلوص کی آزمائش درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کون اس کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے؟ تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہے؟ کفار' مشرکین' ملحدین اپنے باطل نظریات کے لیے جو کچھ قربانیاں دیتے ہیں' جس صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں' تم اگر اپنے مقصد کے لیے اس سے زیادہ صبر کا ثبوت نہیں دو گے تو حق غالب نہیں ہو سکے گا۔ اسی لیے فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا ﴾ —— نہ صرف یہ کہ صبر کرو بلکہ صبر میں اپنے دشمن سے آگے نکلو۔ ان کے صبر سے بڑھ کر صبر کرو ﴿وَرَابِطُوْا﴾ —— مرابطہ کہتے ہیں چوکس رہنا' ہوشیار رہنا' پہرا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن تمہاری غفلت میں تمہارے اوپر حملہ کر دے۔

جب مکہ کے سرداروں کو یقین ہو گیا کہ تشدد کا طریقہ ناکام ہو گیا ہے' نہ حضرت

محمد ﷺ بددل ہوئے نہ ان کے ساتھی تو انہوں نے دوسرا پانسا پھینکا۔ پہلی تدبیر استہزاء‘ تمسخر‘ مذاق‘ demoralize کرنا تا کہ یہ لوگ بتاشے کی طرح بیٹھ جائیں۔ معلوم ہوا کہ نہیں‘ یہ تو کھڑے ہیں تو دوسرا وار مارا گیا کہ ستاؤ‘ تکلیفیں دو‘ بھوکا مارو‘ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاؤ‘ ہلاک کرو۔ معلوم ہوا کہ یہ حربہ بھی ناکام ہوگیا۔ اس تمام تر تعذیب (persecution) سے ایک شخص کو بھی نہ توحید سے ہٹا سکے‘ نہ حضرت محمد ﷺ سے برگشتہ کر سکے‘ بلکہ بات آگے ہی بڑھ رہی ہے۔ ہم نے جتنا دبایا‘ یہ اتنا ہی اُبھر رہا ہے۔ چنانچہ اب تیسرا وار آیا۔ ایک سفارش آئی ابوطالب کے پاس‘ دیکھو تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو باطل ٹھہرا رہا ہے‘ ہم تنگ آ چکے ہیں۔ اگر تو اُسے بادشاہت چاہیے تو ہم اُسے اپنا بادشاہ مان لیں گے۔ اگر اُسے دولت چاہیے تو وہ اشارہ کرے ہم سیم وزر کے انبار اس کے قدموں میں لگا دیں گے۔ کہیں نکاح کرنے کا اشارہ کردے تو جس اونچے سے اونچے گھرانے میں وہ کہے گا ہم اس کی شادی کردیں گے۔ یہ تینوں ہی دنیا کے لالچ تھے۔ بہرحال یہ مرحلے تحریکوں کے لیے بہت ہی نازک ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ کوئی اور ہو تو سوچے گا کہ یہ بادشاہ بنا رہے ہیں تو بن جاؤ۔ اِس وقت تھوڑا سا کمپرومائز کرلو‘ پھر ہاتھ میں قوت آجائے گی تو سب ٹھیک کرلیں گے۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ صحیح طریقہ ہوگا اسی پراسس سے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا۔ دراصل یہ تمام temptations ہوتی ہیں۔ راستے سے بھٹکانے کی کوشش کہ دباؤ سے نہیں مانے تو یہ لالچ انہیں ہٹا دے گا۔ چچا نے جب بات کی حضور ﷺ سے تو آپؐ نے فرمایا! ’’چچا جان! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘ صبر یہی ہے کہ اپنے طے کردہ راستے پر بڑھتے چلے جانا۔ کسی لالچ اور دباؤ میں نہ آنا۔ نہ کسی تکلیف‘ ایذا‘ استہزاء سے متاثر ہوئے بغیر اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کیے چلے جانا۔

انقلابی عمل میں صبر کے دوران پہلا مرحلہ آتا ہے Passive Resistance یعنی صبر محض۔ جھیلو‘ برداشت کرو‘ کوئی مزاحمت (retaliation) نہیں کرنی۔ پھر

ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ آگے بڑھ کر نظامِ باطل کو چیلنج کیا جاتا ہے' یعنی مصابرت (Active Resistance) اور پھر جنگ (Armed Conflict) ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصف)

''بے شک اللہ پسند فرماتا ہے ان لوگوں کو جو قتال کرتے ہیں اللہ کے راستے میں صف در صف جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱﴾

''اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض ان کے لیے جنت (تیار کی) ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے (شہید) بھی (کیے) جاتے ہیں۔ یہ تورات' انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے۔ اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے' تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اسی طرح سورۃ آلِ عمران میں ارشاد فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آیت ۱۴۰)

''یہ دن ہیں جن کو ہم اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں لوگوں کے مابین۔''

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر یہ شعر پڑھا تھا:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا ۔۔۔ عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم وہ ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ سے بیعت کی ہے جہاد کی۔ (اب یہ

جہاد‘ یہ قتال‘ یہ جنگ‘ یہ سرفروشی‘ یہ جاں فشانی جاری رہے گی) جب تک ہماری جان میں جان ہے۔‘‘

یا تخت یا تختہ! یا تو اللہ کا دین غالب ہوگا یا ہم اپنی جان اسی کام میں لگا کر اللہ کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے۔

آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی سطح پر اللہ کی بندگی‘ خود اسلام و اطاعت میں صبر علی المعصیہ‘ صبر علی الطاعۃ۔ دوسری سطح پر یعنی دعوت و تبلیغ میں اپنے کریئر‘ اپنے خوش نما مستقبل پر صبر اور سب سے زیادہ استہزاء‘ تمسخر‘ مذاق‘ فقرے اور جملے جھیلنا۔ ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾۔ تیسری سطح اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے‘ انقلاب لانے کے لیے صبر۔ ایک صبر محض ہے اور ایک مصابرت ہے۔ ایک یہ کہ جھیلو‘ برداشت کرو لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ‘ جبکہ ایک یہ کہ آگے بڑھو‘ باطل کو للکارو اور سامنے والے سے مقابلہ کی صورت میں جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاؤ۔ یہ چھ قسم کے صبر ہیں۔ دو‘ دو صبر ہر لیول کے ہیں۔ دینی فرائض کے تینوں لیول سامنے ہوں گے تو ہی جہاد کے درجات اور صبر کے مراتب بھی بہتر طور پر سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر و جہاد کی توفیق عطا فرمائے!

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
مَیں اسی لیے مسلماں‘ مَیں اسی لیے نمازی!

اَقُوۡلُ قَوۡلِی ھٰذَا وَاَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ لِیۡ وَلَکُمۡ وَلِسَآئِرِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمَاتِ

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

قیمت: 180 روپے

رحمۃٌ لِّلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حافظ محمد اسد ☆

رحمت کا لفظ پڑھتے اور سنتے ہی انسانی ذہن محبتوں اور عنایات کی روح پرور وادیوں کی طرف پرواز شروع کر دیتا ہے۔ گناہ گار خود کو رحمتوں کے حصار میں محسوس کرتا ہے‘ اپنی کمزوریاں اور خطائیں دھلتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔ چشمِ تصور سے اس وقت کا مشاہدہ کریں جب انسانیت شاید رحمت وعطا کے معانی سے ہی نا آشنا ہو چکی تھی۔ جنگ وجدال اور قتل وغارت خاندانی تفاخر کا سبب تھے۔ زنا کاری اور شراب نوشی وجہ امتیاز تھی۔ انتقام اور بدلے کی آگ انسانی وجود کو کھا رہی تھی۔ انسان وحشیوں سے بھی بدتر روپ دھار چکا تھا۔ وحشی درندے بھی اپنی نوزائیدہ اولاد کو زندہ درگور نہیں کرتے اور نہ ہی قتل کرتے ہیں‘ لیکن انسان یہ حد بھی پار کر چکا تھا۔ ایسے میں پروردگارِ عالم نے کائناتِ ارضی پر کرم فرمایا اور محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وجودِ مسعود کی شکل میں اپنی رحمت سے نوازا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریف آوری تمام مخلوقات کے لیے باعثِ راحتِ جاں تھی۔ ہر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وجود کو اپنے لیے رحمت وعطا سمجھنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات اور افکار نے بنی نوعِ انساں کو قتل وغارت گری اور دنگا فساد سے نکال کر محبت والفت کے بندھن میں پرو دیا۔ انسان رشتوں کے تقدس اور اہمیت کو سمجھنے لگا۔ ماں کی ذات جس کا بڑھاپا انتہائی تکلیف اور کس مپرسی سے گزرتا تھا‘ یہ ہمارے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ لوگ اسی ماں کے قدموں تلے جنت تلاش کرنے لگے۔ بیٹیوں کو اپنے لیے عار اور شرمندگی محسوس کرنے والے لوگ ان کے وجود کو باعث رحمت سمجھنے لگے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَتْ عَلَيَّ امْرَأَةٌ وَ مَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا، تَسْأَلُ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي شَيْئًا غَيْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ، فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا،

☆ استاذ قرآن اکیڈمی‘ یٰسین آباد‘ کراچی

فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَأْكُلْ مِنْهَا، ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ، فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْنَا، فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ: ((مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ، كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ)) [اخرجه البخاری:۱۴۱۸‘ ومسلم:۲۶۲۹]

’’اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے ہاں ایک سائلہ عورت آئی‘ اس کی معیت میں اس کی دو بیٹیاں تھیں‘ مگر گھر میں سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے وہی کھجور اُس کو دے دی۔ اُس عورت نے کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں بیٹیوں میں بانٹ دیا‘ خود کچھ نہ کھایا۔ پھر وہ اٹھ کر چل دی۔ جب نبی رحمت ﷺ گھر میں تشریف لائے تو میں نے سارا واقعہ آپ ﷺ کے حضور عرض کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص ان بیٹیوں کے ساتھ آزمایا گیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گی۔‘‘

شانِ رحمۃٌ لّلعالمین ﷺ

یہ آپ ﷺ کی شانِ رحمۃٌ لّلعالمینی کی ایک جھلک تھی کہ دورانِ سفر اگر کسی صحابیؓ نے ہرنی کا بچہ پکڑا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’کون ہے جس نے اس کی ماں کا دل توڑا ہے‘ اس کا بچہ واپس کر دو!‘‘ اگر کسی نے چڑیا کے انڈے اٹھائے تو چشمانِ مبارک اشک بار ہو گئیں۔ کسی نے جانوروں کو چارا اور پانی نہیں دیا تو اس کی سرزنش فرمائی۔ دنیا آج بھی جن لوگوں سے کنارہ کش ہے میرے محبوب ﷺ اُن کے لیے بھی کشادہ دست رہتے تھے۔ ایک بڑھیا نے دورانِ محفل ہاتھ کا اشارہ کر کے بلایا۔ آپ ﷺ تشریف لے گئے۔ اُس نے دست مبارک پکڑا اور چلنے لگی۔ وہ بڑھیا چلتی جا رہی ہے اور اپنے خاص انداز سے حضور ﷺ سے محوِ گفتگو ہے۔ میرے آقا مسکرا رہے ہیں۔ کافی وقت بیت جاتا ہے‘ آپ ﷺ واپس تشریف نہیں لاتے۔ صحابہؓ میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ جب آپ ﷺ کی واپسی ہوئی تو صحابہ عرض کرتے ہیں: ’’ہماری جان آپؐ ہیں‘ روح کا قرار آپؐ ہیں۔ اے رحمت حق! آپ اس عورت کے ساتھ چل پڑے جو پورے مدینہ میں مشہور ہے کہ پاگل ہے‘ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ فرمایا: ’’مجھے یہ بتاؤ کیا میں اُس کا رسول نہیں ہوں؟‘‘

آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی بہترین مثال فتح مکہ کے موقع پر اپنے خون کے پیاسوں

کو معاف کرنا اور امان دینا ہے۔ طائف کے باسیوں کو پتھروں کے بدلے دعا دینا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا تقاضا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور تعظیم ہر مسلمان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک جاگزین ہونی چاہیے جب کہ عوام الناس کی اکثریت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ محض عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منا کر‘ جلسے جلوس نکال کر‘ سیرت کانفرنسیں کر کے یا ذوق وشوق کے ساتھ جھوم جھوم کے نعتیں پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے بحیثیت اُمتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو حقوق ہم پر عائد تھے وہ ہم نے ادا کر دیے ہیں اور اب ہماری شفاعت پکی ہوگئی ہے۔ یہ جھوٹا اور خود ساختہ اطمینان ہمیں اس طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں!

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝۱۵۸﴾ (الاعراف)

’’آپ کہہ دیجیے: لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں‘ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور اُس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ اور اُسی کی پیروی کرو‘ امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔‘‘

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے کی فوز وفلاح اور کامل ہدایت کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع ناگزیر ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی صرف چند انفرادی عبادات یا ظاہری تعلق تک محدود نہیں‘ بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اتباع ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ نفاذِ اسلام اور اقامتِ دین کی جدوجہد ہر مسلمان پر عائد ہونے والی سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری ہے۔

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اقامتِ دین

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد دنیا میں باطل کے تمام نظاموں کو سرنگوں کر کے دینِ حق کو غالب کرنا تھا۔

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹)

’’وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔‘‘

ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ محض زبانی دعوے‘ نعت خوانی یا سالانہ محافل اقامتِ دین کا متبادل نہیں ہوسکتیں۔ مدینہ کی ریاست قائم کر کے عدل‘ انصاف اور احکامِ الٰہی کے نفاذ کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ کا اسوہ ہمیں سکھاتا ہے کہ معاشرے سے ظلم‘ ناہمواری اور باطل نظریات کے خاتمے کے لیے مسلسل کوشش اور جِدّوجُہد ناگزیر ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ: عزّت و بقا کا ضامن

جہاد فی سبیل اللہ وہ عظیم فریضہ ہے جس کے بغیر نہ تو اقامتِ دین کی منزل حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی اُمت کی عزّت و آبرو محفوظ رہ سکتی ہے۔ جہاد کا مقصد دنیا میں فتنہ وفساد اور ظلم کا خاتمہ کر کے اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی میں لانا ہے۔ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں مال‘ وقت‘ صلاحیتوں اور جان کی قربانی پیش کرنا پڑتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے میدانِ کارزار میں سختیاں جھیلیں اور عظیم قربانیاں دیں۔ ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

عظمتِ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ

ڈاکٹر ربیعہ ابرار

اللہ خالق ومصوّر کی بنائی اس وسیع العریض کائنات میں اُس کی شانِ عرفی کے کئی شاہکار مختلف انداز سے انسانی عقل کو مالک کائنات کے کمال وقدرت کے آگے زیر رکھتے ہیں۔ بعض چیزیں اپنے قدو جسامت‘ اپنی ہیئت اور رنگ و بو سے‘ تو کوئی مخلوق اپنے دانش مندانہ طرزِ حیات سے ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس فہرست کمالات میں ایک جہت چیزوں کا وزن بھی ہے جو بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ اس حیرت کدہ میں جسے ہم سیارۂ زمین کہتے ہیں‘ بھاری بھر کم ہونے کے اعتبار سے بدیع السماوات والارض کے ایسے فن پارے موجود ہیں جو اکثر عام لوگوں کی توجہ میں نہیں آتے۔

سرسری طور پر چند ایک کو دیکھیں تو امریکی ریاست Utah میں پائے جانے والا سفیدے کے درختوں کا کنج‘ جو بظاہر ایک جنگل نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک ہی جڑ سے اُگنے والا درختوں کا گروہ ہے جس کا نام پانڈو ہے۔ درختوں کے اس گروہ کو عموماً سب سے بھاری زندہ جاندار قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک درخت کا اوسط وزن چھ ہزار ٹن بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے امریکی ریاست Oregon کے ایک جنگل میں موجود پھپوندی جس کو عظیم الجثہ فنگس کہا جاتا ہے‘ کو دنیا کا سب سے بڑا جاندار قرار دیا ہے۔ اس کے وزن کا تخمینہ تقریباً ۳۵ ہزار ٹن لگایا جاتا ہے۔

انسان کی بنائی چیزوں میں دیوارِ چین سب سے وزنی سمجھی جاتی ہے جس کا وزن دس کروڑ ٹن ہے۔ قدرتی اشیاء کی بات کی جائے تو پہاڑ کئی اعتبار سے ربّ ذوالجلال کی عجب صنعت کاری کا مظہر ہیں۔ ان کے وزن کے بارے میں محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے‘ یقینی بات اس لیے نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کا زیادہ تر حصہ زمین کے اندر موجود ہوتا ہے۔ دنیا کا وزنی ترین مانا جانے والا پہاڑ ماؤنا لوواہے۔ اس کا وزن تقریباً ۲۷۲ کھرب ٹن ہے۔ یہ اس قدر بھاری ہے

کہ سمندر کی تہ اس کے وزن کی وجہ سے آٹھ کلو میٹر نیچے دھنس گئی ہے۔ زیر زمین اسرار کی بات کریں تو ''ایل ایل ایس وی پی ایس'' بے نظیر عجوبے ہیں۔ کسی براعظم کے برابر رقبہ رکھنے والے یہ دو تودے ہیں، جن میں سے ایک بحرالکاہل کے نیچے اور دوسرا افریقہ کے نیچے گہری تہوں میں موجود ہے۔ یہ زمین کے اوپر موجود سب سے اونچے پہاڑ ایوریسٹ سے کئی سو گنا اونچے ہیں، اور زمین کے وزن کا تقریباً ڈیڑھ سے تین فیصد حصہ رکھتے ہیں۔ ہماری زمین کا وزن چھ ہزار کھرب ٹن سے بھی زیادہ ہے۔

ان اوزان کے مقابلے پر انسانی قدرتوں کو پرکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ وزن جو کوئی مضبوط سے مضبوط انسان اٹھا سکتا ہے وہ ۵۰۰ سے ۶۰۰ کلو کے درمیان ہے۔ وسائل کی مدد سے تاریخ میں جو سب سے بڑا وزن ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے وہ ۱.۲ ملین ٹن یعنی ۱۲ لاکھ ٹن ہے۔ اس ساری تمہید، ان بھاری بھرکم اشیاء اور جانداروں کی تفصیل، اور ان کے آگے انسانی وزن اور قدرتوں کی کم مائیگی کا ذکر کرنے کا مقصود، قاری کے سامنے ایک ایسی تصویر کھینچنا ہے، جس کے بعد انسان کو خود پر ربّ کریم کے فضل کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

درج بالا تمام اعداد و شمار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس حدیث کے متعلقہ حصے کو پڑھتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

((.... آمُرُكَ بِ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' ، فَاِنَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعَ وَ الْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ، لَوْ وُضِعَتْ فِي كِفَّةٍ ، وَ وُضِعَتْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِي كِفَّةٍ ، رَجَحَتْ بِهِنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلَوْ اَنَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعَ وَ الْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ كُنَّ حَلْقَةً مُبْهَمَةً ، قَصَمَتْهُنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ...... الخ))

[سلسلة الاحاديث الصحيحة:۳۸۳۸]

''......میں تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرتے رہنا، کیونکہ اگر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو (ترازو کے) ایک پلڑے میں رکھا جائے اور لا الٰہ الا اللہ کو دوسرے پلڑے میں، تو لا الٰہ الا اللہ والا پلڑا جھک جائے گا۔ اور اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک بند حلقے کی شکل اختیار کر لیں تو لا الٰہ الا اللہ اس کو بھی توڑ کر کھول دے گا......''

یعنی ہماری زمین اپنے دیوہیکل پہاڑوں‘ گہرے سمندوں اور وسیع وعریض صحراؤں سمیت ہو‘ پھر زمین کے گرد موجود ہوا‘ جو اپنا وزن اور دباؤ رکھتی ہے‘ پھر دیگر سیارے‘ ستارے سب ایک پلڑے میں ہوں جبکہ دوسرے پلڑے میں وہ ایک کلمہ جو زبان پر نہایت سہل ہے‘ مگر درحقیقت اس قدر جامع ہے کہ ترازو کے پلڑے کو اپنے حق میں جھکا دے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پوری کائنات میں ہماری یہ زمین ریت کے ایک ذرے کے برابر حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت کو سمجھنے کے لیے آپ بہت سی مضبوط چیزوں کو ذہن میں لاتے جائیں‘ پھر ساری زمینوں اور آسمانوں کو اسی کلمہ کے آگے حقیر ہوتا محسوس کریں۔ اس حدیث کی عملی صورت کو اصل شدت سے سمجھنے کے لیے اپنے گرد کسی بھی مضبوط شے پر غور کریں۔ پھر اس حقیقت کو اپنے اندر سرایت کرنے دیں کہ اگر لا الٰہ الا اللہ کوئی مادی وجود رکھتا تو وہ اس مضبوط چیز کو پل میں نیست کر دیتا۔ اگرچہ حدیث میں بیان کردہ حقیقت معنوی یا استعاراتی انداز میں لی جاتی ہے‘ لیکن اللہ عزوجل کی ہر بات ہر لحاظ سے صادق ہوتی ہے‘ یعنی لغوی معنی میں بھی اور استعاراتی معنی میں بھی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیات لغوی اور استعاراتی دونوں ہی معنوں پر صادق آتی ہیں‘ جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (آیت ۲۵)

’’اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت وقوت ہے اور لوگوں کے لیے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔‘‘

ایک عرصے تک علماء کرام لوہے کے اتارے جانے کو ایک شرف اور انعام کے بطور اَنْزَلْنَا کے لفظ کو سمجھتے رہے۔ آج جدید سائنس اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ لوہا ہماری زمین کی پیداوار نہیں‘ بلکہ یہ ۴ء۵ ارب سال قبل زمین کی پیدائش کے وقت بھاری بھرکم ستاروں کے پھٹنے سے ہماری زمین کے مرکز میں شامل ہوا۔ زمین کی سطح پر موجود لوہا جو ہماری رسائی میں ہے‘ وہ بھی زمین کے وجود میں آنے کے اربوں سالوں بعد تک شہاب ثاقب اور سیارچوں کے خلا سے سطح زمین پر برستے رہنے کی وجہ سے ان ذخائر کی صورت میں جمع ہو گیا‘ جنہیں ہم آج کھود کر نکال لیتے ہیں۔ آج سائنسی ایجادات کی ریڑھ کی ہڈی بھی یہی لوہا ہے اور جدید ٹیکنالوجی کا ڈھانچا بھی اسی لوہے کے بل بوتے پر کھڑا ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعلیٰ کی آیات چار اور پانچ جسے علماء متقدمین کھیتی اور سبزے کے خراب ہو جانے سے متعلق سمجھتے رہے‘ آج سائنس کی

دریافتوں کی روشنی میں وہ اسے قدرتی ذخائر کے عمل کی طرف اشارہ گردان رہے ہیں کہ کس طرح سبزہ زمین کی تہوں میں دب کر بے تحاشا دباؤ کے تحت کالے سیال مادے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح لفظوں کے لغوی اور استعاراتی معنی پر پورا اترنے کی ایک خوبصورت مثال سورۃ الاحزاب میں آئی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ﴾ (آیت:۴)

''کسی آدمی کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں رکھے۔''

اگرچہ یہاں ظہار کے پس منظر میں بات کرتے ہوئے یہ بتایا جا رہا ہے کہ جیسے انسان کے ایک جسم میں دو دل نہیں ہو سکتے ویسے ہی بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی' نہ ہی منہ بولا بیٹا زبانی بات سے سگا بیٹا بن سکتا ہے' لیکن اس آیت کو اگر لفظوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو واقعتاً کسی مرد کے جوف میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ اگر یہاں رَجُل کے بجائے النَّاس کا لفظ آتا' تو پھر یہ آیت اپنے لغوی معنی میں نہیں لی جا سکتی تھی' کیونکہ النَّاس میں مرد کے ساتھ عورت بھی آ جاتی ہے' اور حمل کے دوران عورت کے جوف میں اُس کے اپنے دل کے ساتھ اُس کے جنین کا دل بھی دھڑکتا ہے۔ اسی طرح جَوْف کے بجائے صَدْر کا لفظ بھی اس آیت کے لغوی معنی کے ہم آہنگ نہ تھا۔ گویا کلام اللہ کے الفاظ کا چناؤ بھی باریک اور کامل ہے۔ حدیث میں چونکہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں لیکن اس کا مفہوم اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے' تو احتیاط کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی ترازو ایسا ہو کہ زمین و آسمان کو سما سکے' تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کے الفاظ اس کو مغلوب کر دیں گے۔

اس قدر وزنی' مضبوط اور ہر شے سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ بیان ''لا الٰہ اِلا اللہ'' آخر ہے کیا؟ یہ ذکر بھی ہے' اعلان بھی ہے' شہادت بھی ہے اور طرزِ زندگی بھی۔ اس کلمہ کو مختلف زاویوں سے پرکھنے اور اس کی اہمیت کے اسرار کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذکر کے اعتبار سے بات کی جائے تو یہ افضل ذکر ہے۔ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

((اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَ اَفْضَلُ الشُّكْرِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ))

(السلسلة الصحيحة: ٢٧٥٩)

کتنے ہی اذکار اور دعائیں ایسی ہیں جن کا آغاز لا الٰہ الا اللہ سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

جو کَلِمَاتُ الْفَرَجِ (کشادگی کے کلمات) سکھائے ہیں وہ یہ ہیں:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ))

آیت الکرسی (البقرہ:۲۵۵) جو اللہ ربّ العزت کی عظیم ترین صفات‘ اس کے علم اور شان کا بیان ہے‘ وہ بھی اللہ کا تعارف اس ہستی کے بطور کرواتی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر آیت کریمہ جو حضرت یونس علیہ السلام کو سخت ترین آزمائش اور تہ در تہ اندھیروں سے نکال لائی تھی:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾﴾ (الانبیاء)

وہ آیت کریمہ بھی انسان کی اپنی کمزوری اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پاکی کے بیان سے قبل یہ اقرار لاتی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

موت کے وقت تو اس کلمہ کا عوض جنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرَ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (ابوداؤد:۳۱۱۶)

”جس کی آخری بات لا الٰہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

یہ تذکرہ ہمیں ہمارے اگلے مضمون کی طرف لاتا ہے کہ اگر لا الٰہ الا اللہ کو دل میں مان لیا جائے اور اس کا اعلان نہ کیا جائے‘ تو کیا یہ کافی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ذرا تصور کیجیے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریب الموت چچا ابو طالب کے سرہانے موجود ہیں۔ عمر بھر ساتھ نبھانے والے چچا سے ان کی موت کے وقت صرف ایک تقاضا ہے کہ میرے کان میں ہی لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں تو میں گواہ ہو جاؤں (صحیح البخاری:۱۳۶۰)۔ جہاں زندگی میں یہ کلمہ ثواب کا باعث ہے‘ موت کے بعد عذاب سے مانع ہے اور اگلی زندگی کے لیے حُجّت۔

اس گواہی کو دنیاوی زندگی میں بطورِ اعلان لیا جائے تو اس کے کئی ایک سماجی پہلو بھی ہیں۔ یہ کسی تنہا فرد کو ایک ایسے معاشرے کی اکائی بنا دیتا ہے جس کی جان‘ عزت‘ مال کی ذمہ داری اسلامی حکومت کی ہوا کرتی ہے [السلسلة الصحيحة:۹۶۷]۔ البتہ یہ جان پھر ایک امانت بھی بن جاتی ہے کہ اگر جہاد کا اعلان ہو جائے تو اسلامی مقاصد کے تحت ہونے والے قتال میں شرکت فرضِ عین ہو جاتی ہے۔ اس لا الٰہ اِلا اللہ کا اعلان اگر کوئی ریاست کرتی ہے‘ تو کئی ایک ذمہ داریاں ہیں جو اس کے ساتھ عائد ہو جاتی ہیں۔ ایسی مملکت یہ خاموش عہد کر رہی ہوتی ہے

کہ اس زمین پر نظام صرف اللہ کا چلے گا اور قانون وہی نافذ ہوگا جو شریعتِ محمدی ﷺ میں ہے۔ لوگوں کے مابین جب کبھی اختلاف ہوگا تو اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا[النساء:۹۵]۔ ایسی ریاست کی معیشت سود کی نجاست سے پاک ہوگی۔ اس معاشرے میں اگر کوئی عورت تنہا بھی سفر کرے تو اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ ایک غیر مسلم ذمی امن واستحکام سے زندگی گزار سکے گا۔ افسوس کہ آج اس سارے کرۂ ارض پہ کوئی ٹکڑا زمین کا ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ حقیقی معنی میں‘ ہر اعتبار سے ایک اسلامی مملکت ہے!

آخر میں ہم بطور شہادت کلمہ توحید کو پرکھتے ہیں۔ جب کوئی شخص شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ دین اسلام میں داخل ہو جاتا ہے‘ اور قانونی طور پر مسلمان کہلایا اور مانا جاتا ہے۔ وہ اگر مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کا استقبال مختلف ہوتا ہے‘ اس کی موت کی رسومات بھی دیگر ادیان سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کی خوشی‘ غمی ہر چیز کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی حرمتوں کا لحاظ رکھے‘ اس کے شعائر کا احترام کرے‘ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دین محض چند رسومات اور اوامر ونواہی کا نام نہیں۔ یہ ایک گواہی ہے جس کا ادراک اگر کوئی نفس کر لے تو وہ کانپ اٹھے کہ یہ کس قدر بڑی ذمہ داری اور دعویٰ ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

’’جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں‘ کیونکہ میں لا الٰہ الا اللہ (توحید) کی مشکلات اور تقاضوں کو جانتا ہوں۔‘‘

دراصل یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں‘ اس عہدِ الست کی تجدید ہے کہ جب تمام بنی نوع آدم نے یہ اقرار کیا تھا کہ ان کا رب‘ خالق‘ مالک‘ مربی صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ وہاں تو سب نے یک زبان ہو کر اقرار کر لیا تھا لیکن دنیا میں اس کی تجدید وہی کرتے ہیں جن کو توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اس شہادت کے حامل لوگوں پر بسا اوقات یہ دنیا تنگ کر دی جاتی ہے۔ یہ دنیا یوں بھی مومن کے لیے قید خانہ ہے مگر کوئی مسلمان شریعت کی عائد کردہ پابندیوں کا پاس نہ بھی رکھتا ہو‘ تو بھی محض اس کا کلمہ گو ہونا اس کے لیے آزمائش کا سبب بن جاتا ہے۔ آزمائش کتنی ہی بڑی

کیوں نہ ہو‘ اصل حقیقت یاد رکھنے والی یہ ہے کہ رائی کے دانے برابر ایمان بھی انسان کو بالآخر دائمی جنتوں میں لے جائے گا۔ اس کے برعکس کافر زمین کے برابر وزن سونا بھی پیش کرے گا تو اپنی گردن نہ چھڑا سکے گا۔ حدیث مبارکہ میں روزِ قیامت کے ایک منظر کی جھلک یوں دکھائی گئی ہے:

((.....وَيُؤْتَى بِالرَّجُلِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ كَيْفَ وَ جَدْتَ مَنْزِلَكَ؟ فَيَقُولُ اَيْ رَبِّ شَرُّ مَنْزِلٍ، فَيَقُولُ لَهُ: اَتَفْتَدِي مِنْهُ بِطِلَاعِ الْأَرْضِ ذَهَبًا؟ فَيَقُولُ : اَيْ رَبِّ نَعَمْ، فَيَقُولُ: كَذَبْتَ ، قَدْ سَأَلْتُكَ اَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ وَ اَيْسَرَ فَلَمْ تَفْعَلْ فَيُرَدُّ اِلَى النَّارِ)) [السلسلة الصحيحه:۱۵۱۸]

’’......ایک جہنمی کو لایا جائے گا‘ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: اے ابن آدم! تم نے اپنا ٹھکانا کیسا پایا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! بدترین ٹھکانا ہے۔ (رب عزوجل) اس سے فرمائے گا: کیا تم اس سے چھٹکارا پانے کے لیے زمین بھر سونا بدلے میں دے دو گے؟ وہ کہے گا: جی ہاں اے میرے رب۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تُو جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے تم سے اس سے بھی کم اور آسان بات کا مطالبہ کیا تھا لیکن تو نے وہ مطالبہ پورا نہیں کیا۔ پھر اسے آگ میں واپس ڈال دیا جائے گا۔‘‘

’’اَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ وَ اَيْسَرَ‘‘ کا معنی یہاں اقرار لا الٰہ الا اللہ ہی تو ہے۔ انسان سے تو بس اتنا سا تقاضا تھا کہ وہ اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہو جائے اور اس کائنات کے سب سے بڑے سچ کو تسلیم کر لے۔ یہ اقرار کر لے کہ کوئی خدا نہیں‘ کوئی الٰہ‘ معبود نہیں‘ کوئی پالن ہار نہیں‘ کوئی اَن داتا نہیں‘ سوائے اللہ عزوجل کی ذاتِ مبارکہ کے۔

لا الٰہ اِلا اللہ کا زبانی اقرار اگر کامیابی کے لیے ناگزیر ہے تو اس کا قلبی یقین انسان کے لیے ایک الگ ہی سمت کا راستہ آشکار کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا نورِ بصیرت ساتھ لاتا ہے کہ انسان کا طرزِ زندگی ہی بدل جاتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کا عَلَم بردار پھر شترِ بے مہار والی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کی زندگی ایک اعلیٰ ضابطے کی پابند ہوتی ہے‘ جس کے فیصلے بھی بہت سی باتوں کو ملحوظ رکھ کر ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اصول‘ پابندیاں‘ روک ٹوک قید معلوم ہوتے ہیں‘ لیکن درحقیقت یہ انسان کو غلامی کی بہت سی صورتوں سے بچا لیتے ہیں۔ ایک خالق کے آگے جبین خاک آلود کرنے والا دَر دَر سر جھکانے سے بچ جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جو الْمَنَّان کی بارگاہ میں اٹھتے ہیں‘ پھر کسی اور کے سامنے سوالی بن کر دراز نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسی خلاصی ہے جس کی قدر اسی شخص کو ہو سکتی ہے

جس نے زندگی بہت سے شکنجوں میں گزاری ہو۔ معاشرتی اقدار کی قید‘ لوگوں کی تنقید کی فکر‘ گھر والوں کی توقعات کا بوجھ‘ رشتہ داروں کی رضامندی کا طوق‘ ہم عصروں کا دباؤ‘ ان سب بندشوں سے آزاد ہو کر انسان صرف ایک ربّ کا غلام بن جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہ دنیا انسان کو ضرورتوں سے عاجز رکھتی ہے‘ چاہتوں میں اُلجھاتی ہے‘ اپنے مکر و فریب کو خوبصورت بہلاووں کی شکل میں مزیّن کر کے لاتی ہے‘ اور پھر اونچی لہروں کی شکل میں محصور زدہ ناظرین کو اچک کر لے جاتی ہے۔ انسان ان خواہشات کے حصول کے لیے جانے انجانے کس کس دَر پر جھک جاتا ہے۔ ایسے میں کلمۂ توحید ایک مضبوط سہارا ہے‘ جو نہ صرف انسان کے قدموں کو تھام لیتا ہے بلکہ اس کے دل میں بھی کسی باطل معبود کی محبت کو سرایت ہونے سے روک رکھتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اُس کا ہمسر اور مدِمقابل بنا دیتے ہیں‘ وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔ اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبّت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔“

اسی طرح یہ کسی رہبر کی صورت انسان کو ناامیدی کے صحراؤں میں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ جو انسان اپنی شہ رگ سے بھی قریب اپنے رب کو نہیں پہچانتا‘ اس کی بتائی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا‘ اسے ہر سمت سے شیاطین آواز دیتے ہیں۔ وہ آوازیں اسے ایسے راستوں پر لے جاتی ہیں جو گمراہی اور ہلاکت کے ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلۡ اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسۡتَهۡوَتۡهُ الشَّيٰطِيۡنُ فِى الۡاَرۡضِ حَيۡرَانَ ۖ لَهٗۤ اَصۡحٰبٌ يَّدۡعُوۡنَهٗۤ اِلَى الۡهُدَى ائۡتِنَا ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۷۱﴾ (الانعام)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے: کیا ہم پکاریں اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان؟ اور ہم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹا دیے جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی ہے‘ اُس شخص کی مانند جسے شیاطین نے بیابان میں بھٹکا کر حیران و سرگرداں چھوڑ دیا ہو؟ اُس کے ساتھی اُس کو سیدھے راستے کی طرف پکار رہے ہوں کہ آؤ ہماری طرف! کہہ دیجیے: یقیناً اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے‘ اور ہمیں تو حکم ہوا ہے کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار کی فرماں برداری اختیار کریں۔‘‘

کہا جاتا ہے کہ جب عرب رات میں صحراؤں کا سفر کیا کرتے تھے‘ تو جِنّات انہیں آوازیں دے کر بھٹکا دیتے تھے۔ جِنّات کی اکثریت بنی آدم کی مخلص نہیں‘ لٰہذا یہاں ان کی شرارت کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وہ انسانوں کو دھوکا دیتے تھے۔ اللہ عزوجل نے اس آیت کے آغاز میں صحرا میں بھٹکنے کے عمل کو غیر اللہ کو پکارنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ کسی ایسی ہستی سے جو نہ کسی نفع کی مالک ہو سکے نہ نقصان کی‘ آسرے وابستہ کرنا صحرا میں بھٹک جانے کی مانند ہی تو ہے۔

چونکہ کلمۂ توحید کو روحِ بشر میں راسخ کرنے کے ساتھ اسے انسانی عقل سے منوانا بھی مقصود تھا‘ چنانچہ اللہ عزوجل قرآن کریم میں پھیر پھیر کر مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کا ایک تہائی حصہ اللہ کی وحدانیت پر محیط ہے۔ اس میں جابجا اللہ تعالیٰ کے بلاشرکت غیرے اکیلے الٰہ ہونے کا بیان ہے:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵ و آل عمران:۲)

’’اللہ وہ معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ زندہ ہے‘ سب کا قائم رکھنے والا ہے۔‘‘

﴿اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۹۸﴾ (طٰہٰ)

’’حقیقت میں تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے‘ جس کے سوا کوئی اور معبود ہے ہی نہیں۔ اُسے ہر چیز کا علم حاصل ہے۔‘‘

بعض مقامات پر اس توثیقی انداز کے برعکس‘ کسی دوسرے معبود کی نفی کے دلائل لا کر انسانی عقل کو توحید تسلیم کرنے پر جھنجھوڑا گیا ہے۔ مثلاً ایک بہت خوب صورت مثال سورۃ القصص کی آیت ۷۱ اور ۷۲ میں دی گئی ہے۔ ہمارے روز کے مشاہدے اور تجربے کی چیز‘ ہماری زندگی کا اہم جزو‘ یعنی ہمارے دن رات کا ایک دوسرے کے پیچھے‘ بنا کسی رخنے کے‘ غیر محسوس انداز میں آنا جانا۔ فرمایا کہ اگر یہ دن کبھی طلوع ہونے سے انکاری ہو جائے‘ اور ہمیشگی کی رات قیامت

تک کے لیے چھا جائے‘ تو کیا پھر تم کسی ایسے معبود کو جانتے ہو جو تمہارے لیے دن کی روشنی‘ اس کی حرارت‘ اس کی چہل پہل لے آئے گا! تمہارے کام کاروبار‘ عظیم منصوبے‘ پودوں کا آکسیجن تیار کرنا‘ سورج کا سمندر کے پانی کو بادل کی شکل تک لانے کا پورا مرحلہ‘ یہ سب کوئی دوسرا تمہارے لیے کرسکتا ہے؟ یا پھر اس کے برعکس اگر قیامت تک کے لیے اتنے فوائد سے بھرا یہ دن تم پر طاری کردیا جائے‘ تو پھر تم آرام کیسے کرو گے؟ رات کے سکون کو کیسے پاؤ گے؟ اس کے اندھیرے اور خاموشی کی تسکین کہاں ڈھونڈو گے؟ اگر تم کوئی دوسری ایسی ہستی پاتے ہو‘ جو اسی ربط اور بے مشقت انداز میں دن رات کے نظام کو چلانے پر قادر ہے‘ تو پھر ٹھیک ہے وہ ہستی الٰہ کہلانے کی بھی حق دار ہوسکتی ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دن رات کی ہمیشگی کی جو بات کی ہے‘ اس کی ایک جھلک ہمیں اسی دنیا میں دکھادی ہے۔ کرۂ ارض کے قطب جنوبی اور شمالی پر چھ ماہ کا مستقل دن رہتا ہے‘ جس میں سورج نہیں ڈوبتا اور تقریباً چھ ماہ کی رات رہتی ہے‘ جس میں مستقل تاریکی چھائی رہتی ہے۔ آج سائنس قدرتی نظام کو بدلنے اور انسانی آرام کے لیے ہر طرح کی سعی کرنے میں مصروف ہے‘ لیکن وہ ان جگہوں پر معمول کے دن رات لانے سے قاصر ہے۔

اسی طرح سورۃ النمل کی آیات ۶۰ تا ۶۴ میں اللہ تعالیٰ اپنی اور بھی کئی نشانیوں کا ذکر فرماتے ہیں‘ جو اُس کے الٰہ واحد ہونے پر دلالت کرتے ہوئے انسانی سوچ کو دعوتِ فکر دیتی ہیں کہ وہ اپنے شعور کی بنا پر شرک سے باز آجائے۔ فرمانِ باری تعالیٰ کا مفہوم ہے کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے اور آسمان سے بارش برسانے والا کون ہے! آج سائنس دان مصنوعی بارش برسانے کی کوشش کرتے ہیں‘ لیکن وہ یہ بقدر مشقت اور بہت سے وسائل کے بعد ہی کر پاتے ہیں۔ وہ نئے بادل بنانے سے عاجز ہیں‘ اسی لیے آسمان پر پہلے سے موجود نمی بھرے بادلوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بھی مصنوعی بارش نقصان سے خالی نہیں اور ماحولیاتی نظام کو درہم برہم کرسکتی ہے‘ اس کے برعکس اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو بارش برساتے ہیں وہ بیج سے درخت اور ہریالی نکالتی ہے‘ جو دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا۔ تخم ریزی کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: پانی‘ مناسب موسم اور آکسیجن۔ اس سب کے ساتھ کچھ اور بھی ہے جو اگر ساتھ نہ دے تو اس بیج کو اُگنا نصیب نہیں ہوتا۔ سائنس اسے خامروں (Enzymes) کا بیدار ہونا اور hormones کا

توازن کہتی ہے۔ درحقیقت وہ ربّ تعالیٰ کا اِذن ہے‘ اس کا کلمہ ’کُن ‘ ہے۔ جب وہ حکم دیتا ہے تو مردہ (بیج) سے زندہ (پودا) نکل آتا ہے۔

آیت ۶۱ میں اللہ تعالیٰ اپنی صنعت کی بلند پایہ تخلیقات کا ذکر فرماتے ہیں کہ کس طرح سولہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ اپنے محور پر‘ اور ایک لاکھ سات ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے گرد گھومنے والی زمین کو انسانی زندگی کے لیے قرار گاہ بنایا گیا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ حرکت میں ہے بلکہ اپنی ساخت کے اعتبار سے بھی یہ کوئی جامد تختہ نہیں بلکہ اس کی ارضیاتی تختیاں (Techtonic plates) پگھلے ہوئے (نیم مائع) غلافِ ارض (Mantle) پر مسلسل اپنی جگہ بدل رہی ہیں۔ اس سب کے باوجود‘ کششِ ثقل‘ کرۂ ہوائی کے دباؤ اور قشرِ ارض (Crust of the earth) کے غیر معمولی توازن کے باعث‘ یہ انسانی زندگی کے لیے ایک مثالی اور مکمل طور پر مستحکم گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اس زمین کا بنجر پن دور کرنے کے لیے اس پر پانی کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا‘ بلکہ دریا مستقل کٹاؤ کا عمل کرتے‘ مٹی کو بہا لے جاتے‘ اور ارضیاتی پلیٹوں کی قدرتی دراڑوں (fault lines)‘ وادیوں اور ساختی شگافوں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا پیچیدہ اور باہم جڑا ہوا نظام بناتے ہیں‘ جو میٹھے پانی کی تقسیم کے لیے زمین کے خد و خال (topography) کے اندر رچ بس جاتا ہے۔

دریاؤں کے ذکر کے بعد ان کے عمومی مولد یعنی پہاڑوں کی بات کی۔ بلندی پر برسنے والی بارش اور گلیشیرز سے پگھلنے والی برف کا پانی جہاں دریاؤں کے نظام کو وجود دیتا ہے‘ وہیں پہاڑوں کا ایک بڑا مقصد و مصرف یہ ہے کہ وہ زمین کے توازن (isostacy) کو برقرار رکھنے کے لیے میخوں کا کام کرتے ہیں۔ یہ مستقل متحرک ارضیاتی تختیوں کو استحکام بخشتے ہیں‘ زمین کی اندرونی کشیدگی کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں‘ اور زمین کی تیز رفتار گردش کے دوران پتلی قشرِ ارض (کرسٹل پلیٹس) کو شدید لرزش یا پھسلنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک جانب اُس ذاتِ مبارکہ نے ہماری زمین کو دیوہیکل پہاڑوں کے اسباب سے ٹھہرا کر ہمیں دکھایا ہے‘ تو دوسری طرف سمندروں کو تو اُس نے نظر نہ آنے والی ایک آڑ کے ذریعے ملنے سے روک رکھا ہے۔ جب کسی مقام پر کھارے اور میٹھے پانی کے اجسام ملتے ہیں تو نمکیات (شورہ پن)‘ درجہ حرارت اور پانی کی کثافت میں فرق کے باعث‘ ان کے درمیان ایک طبعی سطحی تناؤ کی رکاوٹ قائم ہو جاتی

ہے۔ اس طرح وہ دو سمندر ساتھ چلتے ہوئے بھی اپنی اپنی صفات‘ نمکیات کی مقدار اور آبی زندگی کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہی معاملہ دہانہ پر ہوتا ہے۔ جب دریا سمندر میں گرتے ہیں‘ تو نمکیات کا یہی فرق سمندر کے کھارے پانی کو دریا کے میٹھے پانی میں ملنے سے بچاتا ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کی بنائی تصویر اس قدر باریک مگر جامع نظام اور اصولوں پر کھڑی ہے۔ اگر کوئی دوسرا اللہ ہے جو اس طرح کے متوازن نظام بنا اور چلا سکتا ہے تو پھر وہ عبادت کے بھی لائق ہے!

کائناتی نشانیوں کے بعد انسان کو اس کے اپنے نفس کے روبرو کرایا (آیت ۶۲) کہ کون ہے جو تمہارے دل کو تم سے بھی بہتر جانتا ہے۔ جو دلِ مضطرب کی پکار سنتا ہے‘ جو مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے اور اس نعمتوں بھری دنیا میں تمہیں تمہاری زندگی کا وقتی مختار بنا دیتا ہے۔ وہی تمہیں نسل دَر نسل یہاں بسا رہا ہے۔ ذرا نصیحت تو پکڑو! یہ باطل سہارے بہلاوا تو ہو سکتے ہیں‘ کھوکھلا دلاسا بھی ہو سکتے ہیں‘ لیکن ان میں کشف کی قدرت نہیں کہ تمہاری بند گرہوں کو کھول دیں‘ تمہاری بے قراریوں پر مرہم رکھ دیں۔ تمہاری آرزوؤں کا ثمر صرف ایک اللہ ہی دے سکتا ہے‘ جو مجیب الدعوات اور کاشف السوء ہے۔ وہ لوگوں کو ان کی ذلت اور پستی کے بعد پھر کھڑا کرتا ہے‘ ان کو ایک حالت سے دوسری پر لے آتا ہے‘ ان کی امیدوں کی لاج رکھتا ہے۔ یہ سب اختیار صرف اللہ ہی کا ہے اور اسی کی رحمت کے شایاں ہے۔

مزید فرمایا (آیت ۶۳) کہ وہ ہادی و مرشد صرف دل کو راستے نہیں دکھاتا‘ بلکہ تمہیں تمہارے زمینی اور بحری سفروں میں‘ باوجود اندھیروں کے صحیح منزل پر لے آتا ہے۔ آج بھی لوگ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ نت نئی ٹیکنالوجی اور جی پی ایس کے باوجود‘ وہ بھٹک جاتے ہیں۔ یا اگر یہ سائنسی ذرائع کسی جگہ مہیا نہیں ہوتے ہیں‘ وہاں کسی غیبی مدد کے ذریعے‘ یا کبھی باطن میں الہام ہونے والے اشاروں کی مدد سے‘ انسان کسی بڑے مشکل سفر سے خیریت کے ساتھ پار اُتر جاتا ہے‘ تب اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ اللہ کے خاص کرم ہی سے ممکن ہو پایا ہے۔ اس کی رحمت کا ایک اور انداز بارش سے قبل چلنے والی ہوا ہے‘ جو مٹی کی سوندی خوشبو کے ساتھ‘ اللہ کی رحمت کی اطلاع بھی لے آتی ہے۔ مصنوعی بارش میں اوزون پیدا نہیں ہوتی‘ لہٰذا اس کی میٹھی خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کوئی نقل نہیں کر سکتا تو اللہ کے ساتھ کسی کے الٰہ نہ ہونے کا کیا شک رہ جاتا ہے! وہی اکیلا ہوا‘ بادلوں اور بارشوں کا مالک ہے اور اسی کے

کیے گئے کاموں میں خیر اور رحمت ہے۔

ان آیات کی تکمیل (آیت ۶۴) اس شان سے فرمائی کہ اللہ تو وہ ہے جو عدم سے تخلیق کی ابتدا کرتا ہے۔ کسی خام مال‘ کسی پلان یا فارمولے کے تحت کوئی چیز بنانے والا تو موجد نہ ہوا‘ وہ تو نقال ہوا۔ اللہ ہی نے تخلیق کا آغاز فرمایا‘ اس کا رزق اسے بہم پہنچایا اور پھر وہی اس کا اعادہ فرمائے گا۔ غور طلب بات تو یہی ہے کہ جب کوئی عقلی دلیل اللہ کے سوا کسی خالق کو نہیں پاتی تو پھر لوگ کیوں کر لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے؟ اس قدر دلائل اور مختلف مثالوں کے باوجود نہ ماننے والے کے لیے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَّنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِہٖ ط اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الانعام)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) پوچھیے! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہاری آنکھیں اور تمہارے کان چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو دوبارہ تمہیں یہ (ساری صلاحیتیں) دلائے گا؟ دیکھیے ہم کس طرح ان کے لیے اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں‘ پھر بھی وہ کنارہ کشی کرتے ہیں!‘‘

قصہ مختصر‘ سچ یہی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق‘ انسان کا اپنا وجود اور ہر منطق اسی ایک نقطے پر آکر مرکوز ہے کہ لا الٰہ الا اللہ۔ یہی سبب ہے کہ جب رات کے اندھیرے میں سفر کرتے‘ اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو‘ اللہ عزوجل وادیٔ مقدس میں لاتے ہیں اور انہیں خود سے متعارف کراتے ہیں تو ان الفاظ کے ساتھ کہ:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾ (طٰہٰ:۱۴)

’’یقیناً مَیں ہی اللہ ہوں! کوئی اور معبود نہیں سوائے میرے‘ پس تم میری ہی بندگی کرو۔‘‘

نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بشریت کا اعلان کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ میں تمہارے جیسا انسان تو ہوں‘ لیکن میرے منصب رسالت کی بنا پر مجھ پر جو وحی آتی ہے‘ اس کا نچوڑ یہی ہے کہ تمہارا ایک ہی الٰہ ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ج﴾ (الکہف:۱۱۰)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ مَیں تو بس تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں‘ مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔‘‘

ایک دوسری جگہ حکم دیا کہ نبی مکرم ﷺ اعلان فرما دیں سب انسانوں سے‘ کہ میں تم سب کے لیے اس مالک ارض وسماء کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ ہر نبی کی بنیادی دعوت اور پکار بھی یہی کلمہ توحید رہا ہے۔ جب کسی نبی نے اپنی قوم کو اللہ کا تعارف کرایا‘ تو یہی بتایا کہ وہی عبادت کے لائق ہے کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ سورۃ الاعراف میں حضرت شعیب‘ حضرت صالح‘ حضرت ہود‘ حضرت نوح علیہم السلام سب کی تبلیغ کا یہی انداز بتایا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تو خود اللہ کی گواہی ہے کہ وہ توحید کی اعلیٰ معراج پر قائم تھے‘ اس لیے کہ وہ ایسے وقت میں یکسو اور حنیف تھے کہ جب ساری دنیا میں کوئی دوسرا مسلمان نہ تھا۔ جب تمام عالم شرک میں ڈوبا ہوا تھا تو وہ تنہا ہی ایک اُمّت تھے‘ جنہوں نے اپنا رخ صرف ایک الٰہ کی طرف کر رکھا تھا؛ وہی جو تمام عبادتوں کے بھی لائق ہے اور تمام محبتوں اور امیدوں کا سزاوار بھی!

”لا الٰہ الا اللہ“ اپنے اندر ایک پوری دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ الفاظ کلمہ اخلاص ہیں‘ یعنی جب انسان واقعتاً دل سے یہ گواہی دے دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں‘ تو وہ تسلیم کر رہا ہوتا ہے کہ صرف میری عبادتوں ہی کا نہیں‘ بلکہ میری محبتوں‘ میری مقصدیت‘ عقیدہ‘ حاجتوں‘ جینے مرنے کا مقصد‘ سبھی ایک ہی رب کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی ساری زندگی‘ کوششیں‘ جدّوجُہد یکسو ہو کر ایک ہی مرکز‘ ایک نقطہ پر سمٹ آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اسی جہت میں لے کر آگے بڑھتا ہے‘ یعنی رب کی رضا اور محبت کا حصول۔ پھر یہ کلمہ اخلاص اس لیے بھی ہے کہ اگر کوئی شخص مستقل بھی اس کا ورد کر رہا ہو‘ تو بنا ہونٹوں کو ہلائے‘ زبان سے ادا کرتا رہتا ہے اور برابر میں بیٹھا شخص یہ جان بھی نہیں سکتا کہ اس کا ساتھی افضل الذکر میں مشغول ہے۔ اس طرح اس کا یہ عمل ریاکاری کے شبہ سے بھی پاک ہو گیا۔ پھر صحیح معنوں میں زبان کو ذکر سے تر رکھنے کا فارمولا بھی یہ لا الٰہ الا اللہ ہی ہے۔ یہ چند اسباب ہیں جو اس ذکر اور کلمے کو ایمان کا افضل ترین درجہ بناتے ہیں۔ (ابوداؤد: ۴۶۷۶) باقی اس کے کامل کمال کی معرفت تو صرف اللہ ہی کی ذات کو ہو سکتی ہے۔ اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ اس کلمہ حُجّت کو ہمارا آخری کلام بنائیں تاکہ ہم اپنے ربّ کے وعدے‘ اس کی رحمت کے مستحق ہو سکیں۔ آمین!

❁❁❁

مکّہ معاہدہ

ایوب بیگ مرزا

پاکستان‘ سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان جو دفاعی معاہدہ ہوا ہے اس کی ظاہری شکل سے کون کافر ہوگا جو مطمئن اور خوش نہیں ہوگا! ظاہری طور پر تو یہ ہر ہر لمحہ مانگنے والی ان دعاؤں کا نتیجہ ہے یا نتیجے کا آغاز ہے کہ یاربّ کفر ملّتِ واحدہ کی صورت میں متحد ہے‘ اُمّتِ مُسلمہ کو بھی متحد ہونے کی توفیق دے۔ معاہدہ کا مکہ مکرمہ میں ہونا تو سونے پر سہاگا ہے۔ اللہ کے گھر کا تقدس بھی شامل ہوگیا‘ اللہ تعالیٰ نیتیں بھی پاک کرے۔ آمین! اگر یہ اتحادِ اُمّت کے حوالے سے بارش کے پہلے قطرے کی مانند ہے تو ہر مسلمان کو سجدۂ شکر بجالانا ہوگا۔ البتہ مسلمانوں کو صرف اس کا ظاہر ہی نہیں دیکھنا بلکہ چند سوالات کے جواب بھی تلاش کرنے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ معاہدہ علامہ اقبال کے اس خواب کی تعبیر کی طرف پہلا قدم ہے جسے انہوں نے اس مصرعے میں بیان کیا تھا: ؏ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے: یعنی کیا یہ معاہدہ اُمّت کے مفادات کو بحیثیت مجموعی مدِّنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے‘ یا کسی نے یا ان تینوں نے اپنے اپنے ملک کی ضرورت اور ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ دفاعی معاہدہ کیا ہے؟ راقم کے نزدیک‘ اس معاہدے سے کوئی اپنے اقتدار کا تحفظ حاصل کر رہا ہے جبکہ کوئی معاشی لحاظ سے ضرورت مند ہے اور تحفظ کے بدلے میں اپنی غربت دور کرنا چاہتا ہے۔ اگر خالصتاً اُمّت کا مفاد مقصود ہوتا تو پانچ یا چھ سال پہلے ایسے ہی ایک معاہدے کی تجویز پر ولی عہد سیخ پا نہ ہوتے۔ پاکستان کے اُس وقت کے وزیراعظم سے دورانِ سفر اپنا طیارہ چھین لیا تھا۔ وہ کسی دوسرے ملک کے ہوائی اڈے پر اترنے پر مجبور ہو گئے تھے اور بعدازاں ایک عام پرواز کے ذریعے پاکستان پہنچے۔ پھر یہ کہ پاکستانیوں کو ڈی پورٹ کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ درحقیقت بات دُور بینی اور ویژن کی ہے۔ کوئی اس وقت بھی ان حالات کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہی کام کر کے ’’مبارک مبارک‘‘

کی صدائیں لگائی جا رہی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ''ہر چہ دانا کند‘ کند نادان ـــــ لیک بعد از خرابیٔ بسیار‘‘ یعنی جو کام عقل مند آدمی کرتا ہے وہی بالآخر نادان بھی کرتا ہے لیکن بڑا نقصان اٹھانے کے بعد۔ ایک انتہائی اہم بات جو مال دار ریاستوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ تحفظ اور سالمیت خریدے نہیں جا سکتے۔ امریکہ سے زیادہ طاقتور کون تھا؟ یا سمجھا جاتا تھا؟ عربوں نے امریکہ کو مال دے کر اپنی سلامتی خریدنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔ بہر حال‘ یہ سبق اب خلیجی ریاستوں نے سیکھ لیا ہے۔ امریکہ کے حوالے سے یہ بھی حقائق ہیں کہ وہ سات سمندر پار ہے‘ اتنی دور سے مدد کرنا آسان نہیں اور پھر یہ کہ وہ ایک غیر مسلم ریاست ہے۔ جبکہ اس نے دوسری طرف اسرائیل کے تحفظ کی بھی قسم اٹھائی ہوئی ہے۔ پانچ چھ سال پہلے کا واقعہ تو بطور جملہ معترضہ آ گیا تھا‘ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مکہ معاہدے کو اچھی طرح چھان پھٹک کر اِس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تاکہ اصل صورت حال سامنے آئے۔

اسلام تو مسلمانوں کو ملّتِ واحدہ کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا خلافت کا نظام دیا گیا ہے جس میں اگرچہ مرکزیت ہے لیکن مختلف علاقوں میں گورنر متعین ہوتے ہیں۔ وہ شریعت کی بالادستی کو قائم رکھتے ہوئے خلیفہ کے ہر حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے پاس گورنروں کی تعیناتی اور برطرفی کا مکمل اختیار ہوتا ہے۔ وہ ایک روحانی سربراہ بھی ہوتا تھا۔ مرکزی مسجد میں نماز کی امامت خلیفہ وقت کرتا تھا جبکہ انتظامی معاملات کے حوالے سے بھی اس کا حکم آخری ہوتا تھا۔ بگاڑ کا آغاز اُس وقت ہوا جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اب خلیفہ کے تقرر میں عام مسلمانوں کا کوئی کردار نہ رہا۔ شان وشوکت اور تمکنت حکمرانوں کا طُرّۂ امتیاز بن گئی۔ عوام کی بہبود اور تحفظ طبقۂ اشرافیہ کا مسئلہ نہ رہا۔

ایک تاثر یہ قائم ہوا کہ یہ معاہدہ درحقیقت امریکہ نے کروایا ہے‘ جس کا اصل مقصد ایران کی مخالفت ہے۔ صدر ٹرمپ نے اس معاہدے پر ایک ٹویٹ کے ذریعے خوشی کا اظہار کر دیا اور فوری طور پر ایران کی طرف سے بھی ناپسندیدگی کا اظہار سامنے آیا۔ بعض مبصرین کی رائے ہے کہ ٹرمپ کا اظہارِ خوشی منافقانہ ہے۔ مسلمانوں کے کسی اتحاد پر ٹرمپ کو بھلا کیوں خوشی ہو گی! راقم کی رائے میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکہ اس معاہدے کو خوب اچھالے گا اور اپنی سربراہی میں یورپ کے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا جواز بنائے گا۔ گویا وہ اس کو صلیبی

جنگ کی شکل دینے کی کوشش کرے گا۔ واللہ اعلم! ایران کے بارے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ جتنے زبردست وہ جنگجو ثابت ہوئے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ سفارت کاری کے ماہر ہیں۔ اس کا اقرار تو صدر ٹرمپ جیسے دشمن نے بھی کیا ہے کہ ایرانی بڑے ماہر سفارت کار ہیں۔ ایران نے آغاز میں مکہ دفاعی معاہدے کی مخالفت کی، لیکن بعد میں ترک کر دی۔ حوثیوں کی صورت میں اس کی proxy سعودی عرب پر بدستور حملے کر رہی ہے۔

یہ معاہدہ اس لیے بھی محلِ نظر ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ خلافت ختم ہو چکا ہے۔ اب مسلمان قومی ریاستیں ہیں جن میں وہ اپنے سیاسی، جغرافیائی اور معاشی حالات کو مدِّنظر رکھ کر پالیسیاں بناتے ہیں۔ بعض مسلم ممالک اب بھی امریکہ کے حلیف ہیں؛ مادّی وسائل کے محتاج ہونے کی وجہ سے یا پھر اپنی سیاسی ضرورت کی وجہ سے۔ ایک بات ان تینوں ممالک کی ایک جیسی ہے کہ انہیں اپنے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے، لہٰذا وہ اقتدار کے لیے ملک سے باہر دیکھتے ہیں۔ ترکی کا معاملہ عجب ہے کہ وہ مکہ معاہدے کا بھی حصہ ہے اور نیٹو کا رکن بھی۔ وہ نیٹو جس کے سربراہ سے جب سوویت یونین کی تحلیل کے بعد پوچھا گیا تھا کہ نیٹو سوویت یونین کے خلاف بنا تھا، اس کے خاتمے کے بعد اب نیٹو قائم رکھنے کا کیا جواز ہے؟ تو اس نے کہا تھا کہ ابھی ہمیں مسلم بنیاد پرستوں سے لڑنا ہے۔ گویا ترکیہ دو کشتیوں کا سوار ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے کہا گیا تو جواب ملا کہ کسی بھی ملک پر پابندی نہیں کہ وہ کسی اور اتحاد کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ گویا آپ سحر انگیزی اور شب زدگی کو ساتھ ساتھ لے کر بھی چل سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اُمّت کے بحیثیت مجموعی مفاد کا مسئلہ ہے اور نہ کسی پختہ اصول کو سامنے رکھا گیا ہے بلکہ صرف وقتی مفاد کے تقاضوں کے تحت یہ معاہدہ کیا گیا ہے۔ یعنی کسی کے اقتدار کو تحفظ مل جائے گا اور کوئی معاشی مسائل حل کر لے گا۔ اگر پوری اُمّتِ مُسلمہ کے مفاد کا سوال ہے تو پھر ایران کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔ وہ اگر شامل ہونے سے انکار کر دے تو الگ بات ہے لیکن ایک مسلمان ملک ہونے کے حوالے سے اسے معاہدے میں شرکت کی دعوت تو ملنا چاہیے تھی۔

درحقیقت ولی عہد نے اس معاہدے کے لیے بنیادی اور اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ ان کے سامنے حالیہ امریکہ اسرائیل ایران جنگ ہے، جو وقفے وقفے سے جاری ہے اور جس نے بالآخر ایک منطقی نتیجے تک بھی پہنچنا ہے۔ اس کے کسی بھی نتیجے کو سامنے رکھ کر سعودی عرب کے تحفظ اور

سلامتی کو یقینی بنانے کی ایک کوشش ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ اگر ایران کو خدانخواستہ شکست فاش ہوتی ہے‘ یا امریکہ اور اسرائیل وہاں رجیم چینج کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سعودی عرب کے لیے ایران کا خطرہ ٹل جائے گا لیکن اسرائیل کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس صورت میں پاکستان اور ترکیہ جیسے عسکری لحاظ سے مضبوط ممالک سعودی عرب کو اسرائیل سے بچائیں گے۔ دوسری صورت میں اگر امریکہ اور اسرائیل کو پیچھے ہٹنا پڑ جاتا ہے اور ایران ایک بہت مضبوط ملک کی حیثیت سے خطے میں کنٹرول حاصل کرتا ہے تو پاکستان اور ترکیہ اس معاہدے کی رو سے سعودی عرب کو ایران اور اس کی پراکسیز سے بچانے کے پابند ہوں گے۔

راقم عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ اتحادِ اُمّت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ ہے کہاں؟ مسلمان ممالک ہیں جو اپنے اپنے تحفظ کے لیے سرگرداں ہیں۔ مسلمان ممالک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی ایک ملک میں بھی صحیح قسم کی جمہوریت نہیں۔ سعودی عرب میں بادشاہت ہے۔ پاکستان اور ترکیہ میں جمہوریت ہے‘ مگر درحقیقت نہیں ہے۔ پاکستان کی صورت حال تو سب کے سامنے ہے۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں اصل حکمران کون ہیں! ترکیہ میں بھی عوام بہت بڑی سطح پر طیب اردوان سے بے زار ہیں۔ کوئی یہ بات فراموش نہیں کر سکتا کہ زمانہ جو کروٹ لے چکا ہے‘ اس کے مطابق ہر ملک کی سلامتی کے لیے دو چیزیں لازم وملزوم بن چکی ہیں۔ اگر کسی ملک کی فوج کی پشت پر عوام ہے تو اس فوج کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں‘ وگرنہ ناکامی مقدر ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اگر ملک میں عدل قائم ہے‘ عدالتیں آزاد ہیں اور اپنا فرض ادا کر رہی ہیں تو اس ملک کو کامیاب ہونے اور آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

اب ہم مکہ معاہدے میں بندھ جانے والے تینوں ممالک کے اندرونی حالات کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ آنے والے وقت میں ان کے اصل اور صحیح کردار کا تعین کیا جا سکے۔ جہاں تک سعودی عرب کا تعلق ہے‘ وہاں کے حکمران عوام کو مالی لحاظ سے بہت خوش رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں کسی قسم کی تنگی نہیں آنے دی جاتی۔ کاروباری لوگوں پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔ ایک زمانہ تک تو عوام کو بجلی وغیرہ بھی مفت مہیا کی جاتی تھی۔ عوام کی اکثریت کا مزاج بھی ایسا ہے کہ اگر کھانا پینا اچھا ہے تو سب اچھا ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیاسی طور پر شدید گھٹن ہے۔ حکومت کے کسی بھی اقدام کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ پھر شاہی خاندان میں بہت اختلافات

ہیں۔ جہاں کہیں بادشاہت ہوگی اور جو افراد اقتدار میں براہ راست حصہ دار نہیں ہوں گے ان کے اعتراضات تو ہوں گے‘ اگرچہ اس وقت ولی عہد مکمل کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ بادشاہت جہاں بھی ہوگی‘ اختلافات کی گنجائش نہیں ہوگی‘ جس سے حکومتی مخالفین کو اپنا غصہ یا غبار نکالنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس طرح مخالفین اور ان کے حمایتی حکومت ہی نہیں ریاست کے خلاف بھی اقدام کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں فی الحال سعودی عرب کی موجودہ حکومت کو داخلی سطح پر بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ترکیہ اور سعودی عرب کا کسی دفاعی معاہدہ میں بندھنا بھی گویا تاریخ کو ریورس گیئر لگانے والا معاملہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب عربوں نے طویل جدّوجُہد اور بعض بیرونی قوتوں سے مل کر ترکوں کو عرب سے نکالا تھا۔ ترکوں اور عربوں کی دشمنی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ترکوں کے مطابق‘ عربوں نے خلافت عثمانیہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ مگر معاہدہ اگر یہ دشمنی ختم کرواتا ہے تو یقیناً ایک مثبت پیش رفت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کیا تینوں اسلامی ممالک غیروں اور اسلام دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں؟ اس حوالے سے وہ اپنے تمام مالی اور عسکری مسائل استعمال کریں گے یا یہ محض ایک سوداگری ہے؟ ایک ملک مال کے بدلے دوسرے کی سلامتی کا تحفظ کرے گا‘ اور یہ ایک وقتی ضرورت ہے۔ کل کو وقت اور ضرورت بدل بھی سکتی ہے‘ کیونکہ مالی اور معاشی صورت حال ترکیہ کی بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ البتہ جنگی ساز و سامان کی تیاری کے لیے ترکیہ کی ایک باقاعدہ اعلیٰ درجے کی صنعت ہے‘ ایک پیشہ ور فوج ہے جس کی قیمت ادا کر کے سعودی عرب اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ راقم کی رائے میں مکہ معاہدہ اُمت کے مسائل اور حالات کو سامنے رکھ کر وجود میں نہیں لایا گیا بلکہ ان تینوں ممالک نے وقتی حالات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ معاہدہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمتِ مُسلمہ اب صرف ایک نظری اور تخیلاتی شے ہے۔ مسلم ممالک کے اپنے اپنے مسائل اور ضرورتیں ہیں‘ جن کو مدنظر رکھ کر اپنے مفاد میں اقدام کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ع ’’ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے‘‘ والی بات کہیں نظر نہیں آتی۔

اب آیئے اس معاہدے کے تیسرے اور اہم ترین ملک یعنی پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات کا جائزہ لے کر اس کے عملی کردار کا ذکر کرتے ہیں۔ راقم نے پاکستان کو اس

معاہدے کا اہم ترین رکن قرار دیا ہے تو اس کی ہرگز یہ وجہ نہیں کہ وہ خود پاکستانی ہے بلکہ سیدھی اور سادہ سی بات ہے کہ پاکستان اس معاہدے کا واحد رکن ہے جو ایٹمی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی اسلحہ سازی کی صنعت ترکیہ سے اگر بہتر اور ایڈوانس نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع بڑا اہم بلکہ انتہائی اہم ہے۔ مشرق میں بھارت دنیا کی دوسری بڑی آبادی والا ملک ہے لیکن پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ مغرب میں افغانستان اور ایران ہیں۔ افغانستان وہ ملک ہے جسے عالمی طاقتوں کا قبرستان کہا جاتا ہے اور ایران ایسا اسلامی ملک ہے جس نے امریکہ جیسی عالمی قوت کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ شمال میں چین ہے جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ وہ چین جو صرف پون صدی پہلے افیونیوں کا ملک سمجھا جاتا تھا اُس نے ہر ہر شعبہ میں ترقی کی وہ منازل طے کی ہیں کہ دنیا ورطۂ حیرت میں ہے۔ اُسے آج اقتصادی جِنّ کہا جاتا ہے‘ لیکن وہ جنگی صنعت میں بھی اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ امریکہ کو یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ وہ جلد ہر محاذ پر امریکہ کو پسپا کر دے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت بھی زبردست ہے‘ خاص طور پر فضائیہ کم از کم اسلامی ممالک میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ گزشتہ سال مئی میں اُس نے اپنی کارکردگی سے روایتی حریف کو ذلت آمیز شکست دی تھی‘ جس کا طعنہ امریکہ کے صدر ٹرمپ بھی کئی مرتبہ بھارت کو دے چکے ہیں۔ لہٰذا پاکستان کو مکہ دفاعی معاہدے کا اہم ترین رکن کہنا حقیقت کا اظہار ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں بدترین سیاسی عدم استحکام ہے۔ معاشی حالت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ وہ کسی وقت بھی سلامتی کا مسئلہ بن سکتی ہے۔ خارجی حالات اور پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع اسے ڈیفالٹ قرار دینے سے بچاتا ہے وگرنہ حقیقی طور پر اگر جی ڈی پی اور قرض کا تفاوت دیکھا جائے تو ہم کلینکل ڈیفالٹ کر چکے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام خاص طور پر حکمرانوں اور عوام میں بُعد اس درجے کا ہے کہ جسے بیان کرنے کے لیے حوصلہ درکار ہے۔ بلوچستان اور کے پی کے میں حکومتی رٹ پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ان دونوں صوبوں میں دہشت گردی ایک ایسا معمول بن چکی ہے کہ پنجاب اور سندھ کے لوگ اب اس پر پریشان ہونے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ عوام مہنگائی کی چکی میں بُری طرح پسے جا رہے ہیں۔ ایسے میں وہ سیاست یا حالات کی سنگینی کی طرف توجہ دیں یا اپنے بچوں کی دو وقت کی روٹی کا سوچیں!

صرف پنجاب میں ایک کروڑ سے زیادہ بچوں کو نہ سکول مہیا ہے نہ وہ تعلیم کا سوچ سکتے ہیں۔

پاکستان کی داخلی صورتِ حال پر کسی غیر نے کیا تبصرہ یا تنقید کرنا ہے‘ ملک کے وزیر داخلہ جو حکومت میں طاقتوروں کے نمائندہ ہیں‘ وہ خود ایک تقریب میں موجودہ نظام کے ڈیفالٹ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہمارا نظام پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ اگر یہی نظام چلتا رہا تو ۱۰ سال بعد بھی ہم یہاں بیٹھے حالات کا رونا رو رہے ہوں گے۔ مزید کہا کہ وزیر اعظم ۱۵، ۱۶ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں‘ اگر وہ دن رات بھی کام کریں تو کوئی نتائج نہیں نکلیں گے‘ اس لیے کہ نظام ہی درست نہیں۔ سوال یہ ہے کہ نظام کی ناکامی کا ذمہ دار کون ہے؟ ظاہر ہے وہ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ جو مکمل طور پر با اختیار اور عملی طور پر کرتا دھرتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ پاکستان بننے کے بعد آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن صوبے وہی چار ہیں۔ جب تک چھوٹے یونٹ نہیں بنیں گے‘ کام کیسے چلے گا؟ اتنے بڑے صوبوں کی ایڈمنسٹریشن اچھی کس طرح ہو سکتی ہے۔ سارا بوجھ ایک آدمی پر ہے اور وہی داخلی اور خارجی سطح پر پاکستان کے لیے ڈٹا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان کی مراد آرمی چیف سے ہے۔

ان فرمودات پر اچھا خاصا ردِّعمل آیا۔ شریف حکومت نے اسے اپنے خلاف چارج شیٹ قرار دیا جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی صوبوں کی تقسیم پر سیخ پا ہو گئی۔ اس کا موقف ہے کہ بقایا پاکستان کو جتنے چاہے صوبوں میں تقسیم کرو‘ سندھ کسی صورت تقسیم نہیں ہوگا۔ بلاول بھٹو نے عرصے سے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی ہے: ’’مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں‘‘۔ شریفوں کی حکومت تو ٹھنڈا سا احتجاج رجسٹر کروا کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی کیونکہ کسی زمانے میں پنجاب میں پاپولر تھی‘ اب یہاں کوئی ان کا نام سننے کو بھی تیار نہیں۔ لہٰذا وہ تو جلد اسی تنخواہ پر کام کرنے کو تیار ہو گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے زبردست سٹینڈ کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسے احتجاج کرنے اور سختیاں برداشت کرنے کا تجربہ ہے‘ جس کا عملی مظاہرہ جنرل ضیاء الحق دور میں کیا گیا۔ پھر یہ کہ اُس کے پاس سندھ کارڈ بھی ہے۔ یہ کارڈ وہ اتنی خوب صورتی سے کھیلتی ہے کہ اسٹیبلشمنٹ بھی ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ماضی میں اس نے دریائے سندھ سے نہریں نکالنے کے مسئلے پر مرکزی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے فوری ایکشن یہ لیا کہ صدر زرداری نے اپنی ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا اور مرکزی حکومت کی طرف سے بھیجی

ہوئی سمریوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید صوبوں کے معاملے میں بھی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان پیپلز پارٹی کے سامنے ہتھیار ڈال دیں‘ کیونکہ وزیر داخلہ محسن نقوی نے ایک ایسا بیان دیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یعنی نہ نئے صوبے بنیں گے نہ شریف فیملی کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خلاف چارج شیٹ کے حوالے سے کوئی عملی قدم اُٹھایا جائے گا۔ گویا ان کے مطابق بھی ملک کی حالت سنورے نہ سنورے اقتدار کے شریکوں کو ناراض کر کے اقتدار کے حوالے سے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا بلکہ صورتِ حال سے سمجھوتا ہی کرنا ہوگا۔ اصل مسئلہ اقتدار کا ہے‘ کرسی کا ہے‘ جبکہ اصول بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس پر حکومت اور اسٹیبلشمنٹ سے اچھے تعلقات رکھنے والے ایک صحافی نے زبردست کالم لکھا ہے‘ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی تبدیلی یا بہتری نہیں آئے گی لیکن حکومت یہی چلے گی۔

خارجی طور پر پاکستان کے حکمرانوں نے خود کو ایک عرصے سے امریکہ کے حوالے کر دیا ہوا ہے۔ اس کے بدلے میں امریکہ نے پاکستان کی ایک ایسی حکومت کو سرپرستی کی ضمانت دی ہوئی ہے جو عوام سے مکمل طور پر کٹ چکی ہے۔ بظاہر پاکستان میں ایک سویلین حکومت ہے لیکن یہ حکومت وردی کی سرپرستی کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہیں نکال سکتی۔ پاکستان کا دیرینہ دوست چین جس کے بارے میں یوں تو کہا جاتا ہے کہ پاک چین دوستی کوہ ہمالیہ سے بلند اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے‘ وہ پاکستان سے دور ہٹتا نظر آرہا ہے۔ سوا ارب ڈالر کے قریب وہ قرضہ جو اب واجب الادا ہو رہا ہے‘ پاکستان کی بار بار کی درخواستوں کے باوجود رول اوور نہیں کیا جا رہا۔ سی پیک بھی پیک ہو چکا ہے‘ وہاں کسی بھی مرحلے پر کام ہوتا نظر نہیں آرہا۔ یہ صورت حال پاکستان کو معاشی طور پر مکمل بگاڑ کی طرف لے جا رہی ہے۔ اب انحصار مکہ معاہدہ کے رکن سعودی عرب پر ہے۔ وہ مزید کچھ جھولی میں ڈالے گا تو معاشی سانس بحال ہوگا۔

اب اس کی طرف آتے ہیں کہ پاکستان کو مکہ دفاعی معاہدے سے کسی جنگ کی صورت میں کیا فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے؟ راقم کی رائے میں پاکستان مکہ دفاعی معاہدہ کر کے بری طرح پھنس گیا ہے‘ اس لیے کہ امریکہ اسرائیل ایران جنگ جو وقفے وقفے سے ہو رہی ہے اس کا آخری اور فیصلہ کن راؤنڈ اب چند دنوں یا ہفتوں کی بات ہے۔ اس جنگ کا فیصلہ اگر امریکہ اور

اسرائیل کے حق میں نکلتا ہے تو اسرائیل ایک بہت بڑی طاقت بن کر ابھرے گا۔ ایسے میں اسرائیل لازماً سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک پر حملہ آور ہوگا اور امریکہ اس کا حلیف ہوگا۔ کیا اس صورت حال میں اسرائیل کے سعودی عرب پر حملہ کرنے پر پاکستان اسرائیل پر حملہ کر سکے گا‘ کیونکہ معاہدے میں یہ شرط ہے کہ ایک ملک پر حملہ تینوں پر حملہ تصور ہوگا؟ اگر امریکہ اور اسرائیل پسپا ہو جاتے ہیں اور ایران فاتح کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو وہ یا اس کی پراکسیز کھل کر سعودی عرب پر حملہ آور ہوں گی۔ ایسے میں کیا پاکستان ایران سے جنگ کرے گا؟

یہاں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس جنگ کی وجہ سے ایران پاکستان کے عوام میں بہت پاپولر ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ اہلِ تشیع پاکستان میں بڑی تعداد میں ہیں۔ کیا انہیں ریاست مخالف ہونے سے روکا جا سکے گا؟ یوں ملک میں ایک بہت بڑی تقسیم نظر آئے گی جو قومی سلامتی کے لیے بہت بڑے خطرے کا نشان ہوگا۔ ان تمام حقائق کو مدِنظر رکھ کر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جب تک تمام یا اکثر مسلمان ممالک بشمول ایران متحد نہیں ہو جاتے‘ ان کا سود و زیاں ایک نہیں ہو جاتا‘ وہ ملکی مفاد کی بجائے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو اپنا ہدف نہیں بناتے اُس وقت تک چند مسلمان ممالک کے دفاعی معاہدے سے حقیقی اور عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا بلکہ نقصان ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاہدے میں جلد از جلد مسلمان ممالک کی اکثریت شامل ہو جائے تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے عملی اور حقیقی طور پر فائدہ مند ثابت ہو۔ واللہ اعلم!

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 200 روپے　　اشاعت عام: 75 روپے

قوی مؤمن بنیے!

محمد عثمان عباس

کچھ سال قبل ایک معروف مفتی صاحب نے انٹرنیٹ پر ایک بیان میں ضمناً فرمایا کہ: ’’انسان کو کسی بھی ایسے کام میں لگ جانا چاہیے جو اس کی اور اس کی قوم کی ترقی کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ کو قوی مؤمن پسند ہے‘ اور اگر مسلمانوں میں کوئی قوم طاقت وَر ہو گی تو وہ اللہ کو کمزور قوم کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہو گی۔‘‘ اس پورے بیان کا ایک چھوٹا سا کلپ سوشل میڈیا پر بہت وائرل ہوا۔ ہم اچھا گمان کریں گے کہ شاید اس شارٹ کلپ کو سیاق وسباق سے پھیرا گیا ہو‘ وگرنہ اس پر بھی بات ہو سکتی ہے کہ کیا طاقت وَر قوم سے معاشی اعتبار سے طاقت وَر مراد ہے۔ بہرحال پھر اس کلپ کو پاکستان کے ایک بڑے ای کامرس ٹرینر نے اپنے تبصرے کے ساتھ بطور دلیل شیئر کیا‘ کیونکہ موصوف کے خیال میں قوی مؤمن وہی ہے جو زیادہ مال دار ہو۔ اسی کڑی کی وجہ سے جدید پڑھے لکھے نوجوانوں میں ’’قوی مؤمن‘‘ کی اصطلاح اس خاص معنی کے ساتھ عام ہوئی۔

تحریر کا سبب: دو واقعات

جب راقم نے قرآن اکیڈمی ملتان سے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ ون) کیا تو ایک دوست مولوی عبدالرحمٰن کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا تعلیمی حلقہ بنایا۔ وہاں کے ایک نوجوان طالب علم نے مجھ سے بحث شروع کی کہ ’’قوی مؤمن یعنی مال دار بنو‘‘ میں نے صرف یہ سوال کیا: کیا آپ نے یہ بات فلاں مفتی صاحب کے شارٹ کلپ میں سنی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! اس دن میں نے ارادہ کیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں گا۔

دوسرا واقعہ برطانیہ میں مقیم ایک دوست سے گفتگو کے دوران پیش آیا۔ دنیاوی ترقی کے موضوع پر بات ہو رہی تھی تو انہوں نے مجھے ایک تحریر بھیجی جو حدیث ((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ

خَيْرٌ...)) کی بظاہر من مانی تشریح پر مشتمل لگ رہی تھی۔ مجھے وہ تحریر پڑھتے ہی اندازہ ہوا کہ غالباً چیٹ جی پی ٹی سے لکھی گئی ہے‘ اور دوست نے اس کا اعتراف بھی کیا۔ چیٹ جی پی ٹی ایک مصنوعی ذہن ہے اور وہ اپنے صارف کے دیے ہوئے prompt اور رجحانات کے مطابق لکھتا ہے۔ بعد میں میں نے محض تجربہ کے طور پر اپنے اکاؤنٹ سے سوال کو تھوڑا تبدیل کیا اور پرامٹ بدلا‘ تو چیٹ جی پی ٹی نے تحریر بالکل اس کے برعکس کر دی جو میرے دوست نے بھیجی تھی۔

’’قوی مؤمن‘‘ کی اصطلاح کہاں سے لی گئی؟ شاید میں کبھی اس پر نہ لکھتا اگر اس خاص جدید طبقہ کی طرف سے قوی مؤمن کا اصل معنی صاف واضح کر دیا جاتا۔ پھر ضمناً ترغیب دلائی جاتی کہ آدمی حلال طریقوں سے مال حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ خود کو زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے فارغ کر سکے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کی بھی مدد کر سکے‘ اور دوسروں کے لیے روزگار کا ذریعہ بن سکے۔ قوی مؤمن کے اصلی معنی سے تقریباً صرفِ نظر کر کے اسے ہر صورت میں ’’مال دار بننے‘‘ میں سکیڑ دیا جانا بہت بڑی جسارت ہے۔ یہ اصطلاح دراصل صحیح مسلم کی حدیثِ مبارکہ سے لی گئی ہے‘ جس کا متن درج ذیل ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ، وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ اَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ قَدَرُ اللّٰهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ)) (صحیح مسلم:۲۶۶۴)

’’طاقت ور مؤمن اللہ کے نزدیک کمزور مؤمن کی نسبت بہتر اور زیادہ محبوب ہے‘ جبکہ خیر دونوں میں (موجود) ہے۔ جس چیز سے تمہیں (حقیقی) نفع پہنچے اس میں حرص کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور کمزور نہ پڑو (مایوس ہو کر نہ بیٹھ جاؤ)‘ اگر تمہیں کوئی (نقصان) پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش! میں (اس طرح) کرتا تو ایسا ایسا ہوتا‘ بلکہ یہ کہو: (یہ) اللہ کی تقدیر ہے‘ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے‘ اس لیے کہ کاش (کہنا) شیطان کے عمل (کے دروازے) کو کھول دیتا ہے۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ کی شرح

امام نووی رحمہ اللہ جو صحیح مسلم کے عظیم شارح بھی ہیں‘ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

((المراد بالقوة هنا عزيمة النفس و القريحة في أمور الآخرة، فيكون صاحب هذا الوصف أكثر إقدامًا على العدو في الجهاد، و أسرع خروجًا إليه و ذهابًا في طلبه، وأشد عزيمة في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، و الصبر على الأذى في كل ذلك، و احتمال المشاق في ذات اللّٰه تعالى، و أرغب في الصلاة و الصوم و الأذكار و سائر العبادات، و أنشط طلبا لها و محافظة عليها، و نحو ذلك...))

''یہاں قوت سے مراد نفس کی مضبوط عزیمت اور آخرت کے امور میں ذہنی پختگی ہے؛ اس وصف والا شخص جہاد میں دشمن کے مقابلے پر بڑھ چڑھ کر آتا ہے۔ جہاد کے لیے زیادہ جلدی نکلتا اور اس کی زیادہ طلب رکھتا ہے۔ وہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں سب سے زیادہ پختہ عزم رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس راہ میں ہونے والی اذیت پر زیادہ صبر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ نماز‘ روزہ‘ اذکار اور دیگر عبادات کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے۔ ان کے طلب و محافظت میں زیادہ سرگرم رہتا ہے‘ وغیرہ۔''

دیگر اہلِ علم کی توضیحات

بعض دیگر اہلِ علم نے اس قوت کو وسیع تر معنوں میں لیا ہے۔ اس کا خلاصہ میں نے قطر اوقاف کے زیر اہتمام ایک ویب سائیٹ ''اسلام ویب'' سے لیا ہے کہ طاقتور مؤمن‘ جو اپنے ایمان میں مضبوط ہو‘ اور اپنے جسم اور عمل میں بھی طاقتور ہو‘ اس کمزور مؤمن سے بہتر ہے جو اپنے ایمان میں کمزور ہو یا اپنے جسم اور عمل میں کمزور ہو۔ اس لیے کہ طاقتور مؤمن مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کام کرتا ہے‘ اور مسلمان اس کی جسمانی قوت‘ اس کی ایمانی قوت‘ اور اس کی علمی قوت سے عظیم فائدہ حاصل کرتے ہیں؛ اللہ کے راستے میں جہاد‘ مسلمانوں کے مصالح کو پورا کرنے‘ اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنے میں۔ یہ وہ چیز ہے جس کی کمزور مؤمن میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ اسی اعتبار سے طاقتور مؤمن کمزور مؤمن سے بہتر ہے‘ اگرچہ دونوں میں خیر ہے‘ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ پس ایمان سراسر خیر ہے؛ کمزور مؤمن میں بھی خیر ہے‘ لیکن طاقتور مؤمن اپنے لیے‘ اپنے دین کے لیے‘ اپنے اہل و عیال کے لیے‘ اپنے بھائیوں کے لیے اور اپنی

اُمت کے لیے اس سے زیادہ خیر والا ہوتا ہے۔ اس حدیث میں قوت اختیار کرنے کی ترغیب ہے‘ اور اسلام قوت‘ عزّت اور سربلندی کا دین ہے‘ ہر زمانے میں مسلمانوں سے ہر معاملے میں قوت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال:٦٠)۔ قوتِ ایمان اور عقیدہ میں‘ قوت عمل میں‘ اور قوت جسموں میں؛ کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لیے خیر اور بھلائی کا سبب بنتے ہیں۔

اختتامی نکات

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کئی حضرات مال داری کے اعتبار سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے تھے لیکن اس کے باوجود اُمّت کے اجماعی فہم کے مطابق سب سے افضل‘ سب سے قوی ایمان والے اور سب سے بڑے درجے والے صحابی حضرت صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔

ابھی ایک نوجوان عالم دین وسوشل میڈیا انفلوئنسر کی ویڈیو نظر سے گزری جس میں موصوف علمِ دین کے ساتھ skills سیکھنے اور پیسہ بنانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ظاہر ہے آج کل ایک عام آدمی پر معاش کا اتنا جبر ہے کہ سفید پوش طبقہ تو پس کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس بات کی ترغیب دینی بھی چاہیے تاکہ لوگ کسل مندی کا شکار نہ ہوں‘ لیکن ساتھ ہی موصوف کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کو طاقت ور مؤمن پسند ہے اور انگلیوں سے پیسے گننے کا اشارہ کر کے فرمایا کہ طاقت وَر مؤمن سے یہ مراد ہے۔ کیا ان حضرات سے کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ حال ہی میں اُمّت کے ’’طاقت وَر مؤمن‘‘ مل کر اس قابل نہ تھے کہ خوراک رفح بارڈر پار کروا کے فلسطینیوں تک پہنچا سکتے؟ راقم یہ بات کسی قسم کی مایوسی پھیلانے کے لیے نہیں عرض کر رہا‘ اور یہ دن ہیں جو اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں کہ کبھی ایک کی فتح ہوتی ہے تو کبھی دوسرے کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں ارشاد فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آلِ عمران:١٤٠)۔ اللہ کی مدد و نصرت سے ان شاء اللہ سیاسی غلبہ بھی مسلمانوں ہی کا ہوگا لیکن ہمیں بھی چاہیے کہ اللہ کے دین کے ساتھ مخلص ہو جائیں۔ یہ کیسا طاقتور مؤمن ہے جس کے بینک اکاؤنٹ میں تو کروڑوں روپے ہیں لیکن اس کی ایمانی قوت اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر آمادہ کرنا تو دور کی بات‘ نمازِ فجر کے لیے اٹھانے میں بھی معاون نہیں؟ ❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

مکّہ معاہدے پر خوشی کا اظہار ضرور کیا جانا چاہیے‘ اسے ایک اہم پیش رفت بھی قرار دیا جاسکتا ہے‘ لیکن اِسے اُمّت کی نجات کا حتمی حل سمجھنا درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح امریکی ردِّعمل پر مطمئن ہو جانا بھی دانش مندی نہیں۔ عالمی سیاست میں جب کوئی بڑی طاقت کسی اقدام کی تعریف کرتی ہے تو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اُس تعریف کے پس پردہ اُس کے اپنے مفادات کیا ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی دفاعی معاہدے کی وجہ سے فی الوقت کسی فریق کو پریشانی نہیں ہو رہی تو اس کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی سب کے لیے بے ضرر رہے گا۔ اس لیے خوشی اور اطمینان کے حصول میں محتاط رہنا اور ہر پیش رفت کو اُمّت کے وسیع تر مفاد‘ خودمختاری اور طویل المدت حکمتِ عملی کی کسوٹی پر پرکھنا بے حد ضروری ہے۔

مکّہ مکرمہ سے شروع ہونے والا یہ دفاعی سفر اگر باہمی اعتماد‘ مشترکہ دفاع‘ معاشی تعاون‘ تکنیکی خود کفالت اور بالآخر اُمّت کے وسیع تر اجتماعی مفاد کی طرف بڑھتا ہے تو یہ ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ دنیا اس معاہدے کو کیا نام دیتی ہے؛ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمان خود اِسے کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر مقصد صرف اپنے اپنے قومی مفادات کا تحفظ ہے تو پھر یہ محض ایک اور علاقائی اتحاد ہوگا‘ لیکن اگر اِس کے ذریعے اُمّت کے منتشر شیرازے کو جوڑنے‘ مظلوم مسلمانوں کے لیے مؤثر اجتماعی قوت پیدا کرنے اور عالمی سیاست میں باوقار و خودمختار کردار ادا کرنے کی راہ ہموار ہوتی ہے تو مکّہ کا یہ معاہدہ ایک بڑے سفر کی ابتدا بن سکتا ہے۔ کیا اُمّتِ مُسلمہ دوسروں کے فیصلوں کا انتظار کرتی رہے گی یا اپنی قوت کو منظم کر کے اپنے مستقبل کے فیصلوں میں خود شریک ہوگی؟

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معاہدے کو علامہ اقبال کی اس پیشین گوئی کا مصداق بنائے ؎

عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی‘ ذہنِ ہندی‘ نطقِ اعرابی!

- قرآن مجید میں مستعمل الفاظ کی صرف ونحو کے اعتبار سے ترکیب
- ہر لفظ کی لغوی تحقیق اور صرفی ونحوی تحلیل‘ صیغہ اور لفظ کا اصلی مادہ
- متعلقہ مادہ سے قرآن حکیم میں آنے والے صیغوں کی تفصیل مع حوالہ
- سورہ کا ترجمہ‘ زمانۂ نزول وشانِ نزول‘ سورہ کا موضوع اور خلاصۂ مضمون

درج بالا اور اس جیسی دوسری خصوصیات کی حامل
اپنی ترتیب اور نظم سے مرتب کی گئی قرآن مجید پر اردو کی پہلی کتاب

لغات واعراب القرآن

جُزء عَمَّ (سورۃ النبا تا سورۃ الناس)

ابوجنید ساجد افضل

گرامر کے اعتبار سے قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے والے
اساتذہ‘ طلبہ اور عام قارئین کے لیے انتہائی مفید

صفحات: 1280 | قیمت: 3500 | عمدہ طباعت اور مضبوط جلد

کتاب کے حصول کے لیے

- مکتبہ خدام القرآن: 36 کے‘ ماڈل ٹاؤن‘ لاہور (Whatsapp: 0301-1115348)
- مکتبہ سید احمد شہید: الکریم مارکیٹ‘ اردو بازار‘ لاہور
- مکتبہ رحمانیہ: غزنی سٹریٹ‘ اردو بازار‘ لاہور
- مکتبہ القدوسیہ: غزنی سٹریٹ‘ اردو بازار‘ لاہور
- کتاب سرائے: الحمد مارکیٹ‘ غزنی سٹریٹ‘ لاہور
- مکتبہ اسلامیہ: کوتوالی روڈ‘ بالمقابل کوتوالی پولیس سٹیشن‘ گھنٹہ گھر‘ فیصل آباد

Cash on Delivery: Whatsapp on 0312- 4842222 (Author)

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جدید تعلیم یافتہ حضرات و خواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

رجوع الی القرآن کورس

ان شاء اللہ

انٹرویو: یکم ستمبر 2026ء

آغازِ کلاسز: 2 ستمبر 2026ء

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 8:15 تا 1:00

ایئر کنڈیشنڈ کلاسز

عرصہ 44 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔

تعلیم : کم از کم انٹرمیڈیٹ

عمر : کم از کم 22 سال

دورانیہ : 10 ماہ

مضامین تدریس:

پارٹ 1 (سالِ اول)

برائے مرد و خواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف و نحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری و لغوی توضیحات)
- دورۂ ترجمہ قرآن
- قرآنِ حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
- سیرت و شمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث و اصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ 2 (سالِ دوم)

برائے مرد حضرات

- عربی زبان و ادب
- اُصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اُصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اُصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروالیں۔

زیرِانتظام:

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز
مرکزی انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) لاہور

بمقام:

قرآن اکیڈمی
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور

مزید تفصیلات کیلئے:

email: irts@tanzeem.org
www.khuddamulquran.org
0316-1466611 042-35869501

PHARMA

Your **Health**
Our **Devotion**

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION | TECHNOLOGY | COMPLIANCE

www.nabiqasim.com

Aug 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.8

Monthly **Meesaq** Lahore